Regd. L. No.7243
Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1975

اِس پرچہ میں

۱۔ پرویز صاحب کا اِستقبالیہ (گفتنی)
"خدا اپنے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں"

۲۔ "مودودی صاحب کی تفسیر پر تبصرہ"

شائع کردہ: اِدارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون نمبر	بدلِ اشتراک
۱½ ڈیڑھ روپیہ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان ۔۔ ۱۵ روپے غیر ممالک ۔ ۲ پونڈ
شمارہ ۱۱	نومبر ۱۹۷۵ء	جلد ۲۸

فہرست

۱۔ لمعات ۲

۲۔ قربانی کے بارے میں علمائے الجزائر کا فتویٰ ... (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) ۶

۳۔ حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں .... } ۹
(طلوعِ اسلام کنونشن میں پرویز صاحب کا استقبالیہ)..

۴۔ مطالب الفرقان ۴۰

۵۔ مودودی صاحب کی تفسیر پر تبصرہ ..... (محترم محمد اسلام)........ ۴۱

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد ۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

جیساکہ سابقہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا، طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن ۲۳ لغایت ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو منعقد ہو رہی ہے۔ چونکہ پرچہ طباعت کے لئے پریس میں جلدی بھیجنا ہوتا ہے اس لئے ہمیں افسوس ہے کہ اس شمارہ میں کنونشن کی روئیداد شائع نہیں ہو سکے گی، اگرچہ ہمیں اس کا احساس ہے کہ طلوعِ اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر سے وابستہ یا دلچسپی رکھنے والے حضرات کو، جو کسی وجہ سے اس کنونشن میں شرکت نہیں کریں گے، اس کی روئیداد دیکھنے کا کس شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ جس وقت یہ سطور زیرِ تسوید ہیں ادارہ اور اس کے معاونین، کنونشن کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور اس میں شرکت کرنے والوں کی اطلاعات جس تیز رفتاری سے موصول ہو رہی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالیہ کنونشن (بعونہٖ تعالےٰ) پہلے سے بھی زیادہ کامیاب ہوگی۔ ہمارے اس اندازہ کی بنیاد یہ بھی ہے کہ طلوعِ اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ یہ فکر کیا ہے اور اب اربابِ ذوق و تجسّس اس کی طرف لپک کر کیوں آ رہے ہیں، یہ بات سمجھنے کے قابل ہے۔

قرآن کریم خدا کی طرف سے متعین کردہ دین لے کر آیا تھا۔ دین کے معنی ہیں نظامِ حیات اور اس کی عملی شکل ہے ایک ایسی مملکت کا قیام، جس میں ہر فیصلہ قرآن کریم کے ارشاد فرمودہ احکام و اصول و اقدار کے مطابق ہو، اور کوئی اقدام ان حدود سے تجاوز نہ کرے، جنہیں اللہ تعالےٰ نے مقرر کر دیا ہے۔ اِس مملکت میں اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں نہیں رہتا — نہ کسی ایک فرد کے اور نہ ہی افراد کے کسی گروہ کے، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ جب قوانین وضع کرنے کا اختیار ہی کسی کے ہاتھ میں نہ ہو، تو حصولِ اقتدار کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ نہ ہی اس میں مذہبی پیشوائیت کا وجود باقی رہتا ہے۔ کیونکہ جملہ امورِ شریعت کا انصرام خود مملکت کے ذمہ ہوتا ہے۔ وہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہم فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ نہ ہی اس میں نظامِ سرمایہ داری کا نشان تک باقی رہتا ہے۔ کیونکہ تمام افرادِ معاشرہ کے لئے اسبابِ زیست مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مملکت اس عظیم ذمہ داری سے اُسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے جب وسائل اور ذرائع رزق اُس کے زیرِ انتظام ہوں۔ اس تمام نظم و نسق کی بنیاد خدا کے قانونِ مکافاتِ

عمل پر ایمان پر ہوتی ہے۔ اسی کو ایمان بالآخرت بھی کہا جاتا ہے۔

اس قسم کا نظام حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم، اور آپؐ کے بعد آپؐ کے سچے جانشینوں نے عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد دین مذہب میں تبدیل ہو گیا، اور جیسا کہ ہر مذہب میں ہوتا ہے، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری نے پھر سے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ مذہب کا یہ نظام اب تک قائم ہے۔ طلوعِ اسلام کا مشن مروجہ مذہب کے بجائے اُسی دین کا احیاء ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت سے مقصد، قوم کے دل و دماغ میں اس اہم تبدیلی کی اہمیت کی وضاحت اور اُسے عمل میں لانے کے جذبہ کو بیدار کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اربابِ اقتدار، اربابِ مذہب اور نظامِ سرمایہ داری کے حاملین کی طرف سے اس فکر کی مخالفت لازمی امر ہے۔ اس مخالفت میں اربابِ حکومت اور نظامِ سرمایہ داری کے مؤیدین تو پسِ پردہ رہتے اور بالواسطہ مخالفت کرتے ہیں، لیکن اربابِ مذہب اِس محاذ میں ہراول دستہ کی حیثیت اختیار کرتے، اور براہِ راست مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے پاس اپنے مسلک کی تائید میں کچھ وضعی روایات ہوتی ہیں جنہیں وہ حضور نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور کچھ اسلاف کے مقدس نام سے جن کی اندھی تقلید کو وہ عین دین قرار دے کر عوام کو اپنے پیچھے لگائے رکھتے ہیں۔ اربابِ مذہب کی یہ مخالفت اُس وقت بڑی شدید ہو جاتی ہے، جب مذہب منظم حیثیت اختیار کر لے۔ تاریخ میں منظم مذہب کی بیّن مثال یورپ میں پادریوں کا قائم کردہ کلیسائی نظام (چرچ) ہے۔ اِس نے اپنے منظم پروپیگنڈے کے زور پر ایسی قوت حاصل کر لی تھی کہ بادشاہوں تک اُن سے ڈرتے اور کانپتے تھے۔ انہوں نے ساری فضا میں دہشت پھیلا رکھی تھی اور وہ ہر کہ و مہ کے اعصاب پر کابوس بن کر مسلط ہو چکے تھے۔ اقوامِ یورپ نے جن جانکاہ مشکلات اور صبر آزما دشواریوں کے بعد کلیسا کے فولادی پنجے سے اپنی جان چھڑائی، وہاں کی تاریخ کے خونی اوراق اس کی زندہ شہادت ہیں۔ پاکستان میں اِس قسم کے منظم مذہب کی حیثیت جماعتِ اسلامی نے اختیار کرنا چاہی تھی تاکہ وہ اس طرح اقتدار اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ اُسے اپنے راستہ میں طلوعِ اسلام سب سے بڑی رکاوٹ نظر آتا تھا۔ (واضح رہے کہ اِس کے ان عزائم کو بھانپ کر طلوعِ اسلام نے تقسیمِ ہند سے بھی پہلے ان کی مخالفت کی تھی) اِس مقصد کے لئے انہوں نے طلوعِ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا اور چونکہ جھوٹ بولنا ان کے مذہب میں جائز ہی نہیں بلکہ واجب قرار پاتا ہے اور عندالضرورت اصولوں کو پسِ پشت ڈال دینا ان کے نزدیک (معاذاللہ) اتباعِ سنتِ نبویؐ ہے، اس لئے انہوں نے اس پروپیگنڈہ میں طلوعِ اسلام کے خلاف ہر قسم کے جھوٹے الزامات تراشے — یہ منکرِ حدیث ہے، یہ منکرِ شانِ رسالتؐ ہے، تین نمازوں اور دو رکعتوں کا قائل ہے، اردو زبان میں نمازیں پڑھنے کی تلقین کرتا ہے، ایک نیا فرقہ وجود

میں لا رہا ہے۔ اس کا بانی دعویٰ ثبوت کرے گا ـــــ یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں اتہامات اس چابکدستی سے تراشے اور ایسے منظم طریق پر عام کئے کہ عوام تو ایک طرف، اچھے اچھے سمجھ دار لوگ بھی طلوعِ اسلام کو (WET - PAINT) سمجھنے لگ گئے۔ اس پروپیگنڈہ کو انہوں نے طالب علموں کے طبقہ میں خاص طور پر پھیلایا۔ یہ سازش بڑی گہری اور اس کے نتائج بڑے دُور رس تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ آج کے طالب علموں کا بیشتر حصّہ پانچ سات سال کے بعد حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہو گا۔ چنانچہ ان کی اسکیم کامیاب ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں، جس میں اس جماعت کے قالب میں ڈھلے ہوئے طالب علم افسر بن کر نہ بیٹھے ہوں۔ وہ وہاں، بعض مصالح کے تحت، کھلے بندوں اس جماعت سے اپنی وابستگی کا اعلان تو نہیں کرتے، لیکن طلوعِ اسلام کی مخالفت اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ان کے شعبہ میں کوئی ایسا مسئلہ زیرِ بحث آئے، جس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق اسلام سے ہو، اور وہاں کسی طرح طلوعِ اسلام کا نام سامنے آجائے تو وہ نہایت بھولے پن سے کہہ دیں گے کہ اسے درمیان میں نہیں لانا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے خواہ مخواہ فرقہ وارانہ جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں گے اور (CONTROVARSY) شروع ہو جائے گی۔ حکومت کو یہ مصیبت مول نہیں لینی چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ جب افسروں کی یہ ذہنیت ہو تو ان کا ماتحت عملہ (خوشامدانہ ہی سہی) انہی کے نقشِ قدم پہ چلنے میں فخر محسوس کرے گا۔

اِن کا اسی قسم کا پروپیگنڈہ ہے جو قرآنی فکر کے راستہ میں قدم قدم پہ رکاوٹیں کھڑی کرتا چلا آ رہا ہے۔ طلوعِ اسلام نے نہ کوئی الگ جماعت بنائی، نہ کوئی فرقہ پیدا کیا۔ نہ کہیں سے کوئی امداد حاصل کی۔ نہ قربانی کی کھالیں اکٹھی کیں، نہ صدقہ زکوٰۃ کے روپے بٹورے۔ یہ اپنے محدود وسائل سے کام لے کر اپنی دھن میں آگے بڑھتا گیا۔ اور چونکہ یہ اپنی ہر بات قرآن کریم کی سند اور دلائل و براہین کی رو سے پیش کرتا تھا، اس لئے اِس جماعت کے اس پروپیگنڈہ کے باوجود، جن اربابِ فکر و نظر نے طلوعِ اسلام کے پیش نہاد پر ٹھنڈے دل سے غور کیا تو ان کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو کر آ گئی۔ دوسری طرف، جماعتِ اسلامی نے اتنی قلابازیاں کھائیں کہ اِن کے چہرے پہ پڑے ہوئے نقاب خود ہی اُٹھتے چلے گئے۔ اِس سے بھی قرآنی فکر کے آگے بڑھنے کی رفتار کو تقویت ملی۔ اور ملک کے دانشور طبقہ کے دل میں اس کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کا احساس پیدا ہوا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس فکر سے متعلق لٹریچر کی مانگ اتنی بڑھ رہی ہے کہ ہم اپنے محدود وسائل کی بنا پر اُسے پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ بہرحال طلوعِ اسلام، اس فکر کی اشاعت کو اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہے، اِس لئے وہ اس سمت میں امکان بھر کوشش کئے چلا جا رہا ہے۔ طلوعِ اسلام کی کنونشنیں بھی اسی سلسلہ کی مؤثر کڑیاں

ہیں۔ اس میں، اس فکر سے متفق حضرات مل بیٹھ کر یہ سوچتے ہیں کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کے لئے کیا تدبیر اختیار کی جائیں۔

کنونشن میں پرویز صاحب کا استقبالیہ ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اُسے زیرِ نظر اشاعت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو خطابات ہیں۔ ایک کا عنوان ہے ـــــ وہ ہمارا خواب تھا، یہ خواب کی تعبیر ہے ـــــ اس میں انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا، اور وہ کیا بن کر رہ گیا ہے! اُن کے دوسرے خطاب کا عنوان ہے ـــــ جہاں مارکس ناکام رہ گیا، اُس سے آگے ـــــ یہ بڑا معلومات افزا اور بصیرت افروز خطاب ہے۔ جس میں اُن مسائل کی تاریخ بیان کرنے کے بعد جو انسانی فکر نے، انسان کے معاشی مسئلہ کا اطمینان بخش حل دریافت کرنے کے سلسلہ میں افلاطون سے لے کر مارکس تک کی ہیں، یہ بتایا گیا ہے کہ ان مشکلات کا حل صرف قرآن کا معاشی نظام پیش کرتا ہے۔ کمیونزم کی ناکامی کا اعتراف تو خود مارکس کر چکا ہے۔ یہ خطابات آئندہ اشاعتوں میں شائع ہوتے رہیں گے۔ ان کے علاوہ دیگر اہلِ فکر حضرات کے مقالات بھی کنونشن میں پیش ہوں گے۔ ان میں سے "ماہرِ مودودیات" محترم محمد اسلام صاحب کا مقالہ اسی اشاعت میں پیشِ خدمت ہے۔ کنونشن کے مذاکرہ میں ہماری نوجوان تعلیم یافتہ نسل کے نمائندے (طلباء اور طالبات) حسبِ سابق بڑے ذوق و شوق سے حصّہ لے رہے ہیں۔ ان کے مقالات بھی طلوعِ اسلام میں شائع ہوتے جائیں گے۔

پرویز صاحب کے استقبالیہ میں اُن کے اس گراں مایہ تحفہ کا ذکر سامنے آئے گا، جسے وہ اپنا حاصلِ زندگی قرار دے رہے ہیں ـــــ یعنی قرآنِ مجید کی تفسیر، خود قرآنِ مجید سے ـــــ جس کی جلد اوّل (مطالب الفرقان کے نام سے) کنونشن میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکے گا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ جس مفکر نے اپنی ساری عمر قرآنِ کریم پر غور و تدبر میں صرف کی ہو، عمر کے آخری حصّہ میں اس کا ماحصل کن خصوصیات کا حامل ہو گا؟

اس ماہ، اس مختصر سی ملاقات کے بعد، ہم قارئین سے، کنونشن کے انعقاد پر مبارکباد اور اس کی کامیابی کے لئے ان کی نیک آرزوؤں کے ساتھ، رخصت چاہتے ہیں۔ والسلام

کھاتہ دار متوجہ ہوں:۔ پرویز صاحب کی ایک مدت سے نایاب کتاب جہانِ فردا کا دوسرا ایڈیشن چھپ کر آ گیا ہے۔ حسبِ معمول یہ کتاب کھاتہ داروں کو بصیغۂ رجسٹرڈ بک پوسٹ بھیجی جا رہی ہے۔ اگر کسی کھاتہ دار کو کتاب درکار نہ ہو تو وہ ۱۵ نومبر ۱۹۷۵ء تک ہمیں اس امر سے مطلع کر دیں۔
(ناظم ادارہ)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

حج پر قربانی کے بارے میں علمائے الجزائر کا فتویٰ

چند سال پہلے قربانی کے بارے میں الجزائر کے ایک سابق صدر نے ایک حکم جاری کیا تھا کہ ہر محلے میں صرف وہاں کا امام مسجد اہلِ محلہ کی طرف سے ایک جانور کی قربانی دے۔ اس پر پاکستان سمیت اسلامی دُنیا کے علماء میں کافی لے دے ہوئی تھی، اور ہو رہی ہے۔ اس حکمنامے کی اصل بنیاد علمائے الجزائر کا وہ فتویٰ تھا، جس میں انہوں نے حج کے موقع پر جانوروں کی قربانی دینے کی بجائے ان کی نقد قیمت غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دینے کے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔ یہ نقد قیمت مکہ مکرمہ کے فقراء میں بھی تقسیم کی جا سکتی تھی اور "فی سبیل اللہ" کے دوسرے کاموں میں بھی خرچ کی جا سکتی تھی۔

پچھلے کئی سالوں سے الجزائر کے حجاج اسی فتوے پر عمل کرتے ہوئے جانور کی قربانی دینے کی بجائے اس کی نقد قیمت خیرات میں دے دیا کرتے تھے۔ سعودی عرب میں الجزائر کے سفیر الشیخ محمد الفسیری ایک بہت بڑے عالم دین تھے اور اکثر اپنے وطن کے حج وفد کی قیادت کرتے تھے۔ وہ بھی اسی فتوے پر عمل کرتے تھے، اور منیٰ میں جانور کی قربانی دینے کی بجائے اس کی نقد قیمت خیرات میں دے دیا کرتے تھے۔ یہ گویا ایک طرح سے حکومتِ الجزائر کی سرکاری پالیسی قرار پا گئی۔ جس سے دوسرے ممالک کے حجاجِ کرام بھی متاثر ہونے شروع ہو گئے۔ پچھلے سال الشیخ محمد الفسیری وفات پا گئے تو ان کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرے ممالک کے علماء نے الجزائر کے حجاج پر اعتراضات کرنے شروع کر دیئے کہ شریعتِ اسلامی میں ایسا کرنے کی اجازت نہیں۔

الجزائری حاجیوں نے اس سلسلے میں کسی بحث میں الجھنے کے بجائے نہایت مثبت اور معقول رویہ اختیار کیا جو دوسرے اسلامی ممالک کے لئے بھی قابلِ تقلید ہے۔ اور وہ یوں کہ انہوں نے واپسی پر یہ سارا معاملہ اپنی حکومت کے سامنے پیش کیا۔ حکومتِ الجزائر نے اس پر جو کارروائی کی، اس کی تفصیلات الجزائر کے نیم سرکاری ترجمان روزنامہ "الشعب" کی ۲۹ جمادی الثانی

۱۹۳۵ء ——— میں شائع ہوئیں ہیں۔ آئندہ سطور میں ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

حج کے موقع پر قربانی کے عوض جانور کی قیمت خیرات میں دینے کا اصل فتویٰ الجزائر کے مشہور عالمِ دین علامہ الشیخ البشیر الابراہیمی مرحوم نے دیا تھا۔ آج سے چند سال پہلے ان کی وفات تک علامہ موصوف کی سارے عالمِ عرب میں دھوم تھی۔ اور ان کے ہفتہ وار رسالے "البصائر" کی اشاعت سارے عالمِ عرب میں زیادہ تھی۔ مودودی صاحب کو عالمِ عرب میں متعارف کرانے کا سہرا زیادہ تر انہی کے سر ہے۔ مودودی صاحب جب مسئلہ کشمیر کے فتویٰ کے سلسلے میں گرفتار ہوئے تو علامہ صاحب ان دنوں پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے ہفت روزہ البصائر میں مودودی صاحب کے تعارف میں ایک مضمون بعنوان "مَنْ ھو المودودی" لکھا تھا۔ جس کا جماعتِ اسلامی کے تمام رسائل و جرائد میں بڑے اہتمام سے ترجمہ اور فوٹو شائع ہوئے تھے۔ اسی بنا پر جماعتِ اسلامی والے علامہ البشیر الابراہیمی مرحوم کو اپنے ہاں بہت اونچا مقام دیتے تھے۔

شیخ البشیر الابراہیمی کو علماء میں جو مقام حاصل تھا، کسی عالمِ دین کو ان کے اس فتویٰ پر اعتراض کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد شیخ محمد الفضیری جو سعودی عرب میں الجزائر کے سفیر بھی تھے، اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ چونکہ وہ بھی ایک معروف عالمِ دین تھے۔ اس لئے ان پر بھی کسی نے اعتراض نہ کیا۔ تاہم پچھلے سال ان کی وفات کے بعد علماء نے اس فتویٰ پر اعتراضات کرنے شروع کئے تو الجزائر کے علماء کو شیخ بشیر الابراہیمی مرحوم کے فتویٰ کی تلاش ہوئی۔ ہمارے عرب بھائی چونکہ نسبتاً سہل انگار واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے انہیں یہ فتویٰ کہیں چھپا ہوا نہ مل سکا، اگرچہ وہ برسوں سے سینہ بسینہ وہاں کے علماء میں چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ کے مناسب تصفیہ کے لئے یہ معاملہ الجزائری مجلسِ افتاء کے سامنے پیش کیا گیا۔

الجزائر کی مجلسِ افتاء نے جو عام طور پر خود فتویٰ صادر کر دیتی ہے۔ اس بارے میں مزید احتیاط سے کام لیا۔ اس نے مختلف صوبوں کے علماء کو بھی اس مقصد کے لئے دعوت دی اور وزارتِ امورِ دینیہ کے ماہرین کے علاوہ الجزائر یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے اساتذہ کو بھی کمیٹی میں شریک کیا۔ ان حضرات نے قربانی کے جانور کو ذبح کرنے کی بجائے اس کی قیمت کو خیرات کر دینے کے جواز کے لئے جو دلائل دیئے ان کا لفظی ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

(ترجمہ) (ا) اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ موجودہ دور میں منیٰ میں قربانی کا انتظام کرنا حد درجہ مشکل ہو چکا ہے۔ اور اس کی وجہ سے کئی قسم کے مفاسد ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں جو حجاج کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔

(ب) اور اس فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے جو مجلسِ افتاء کے بعض شرکاء نے بیان کیا کہ علامہ الشیخ الابراہیمیؒ نے جو مشہور علمائے اسلام میں سے تھے، مکہ مکرمہ میں قربانی کے عوض اس کی نقد قیمت ادا کر دینے کے بارے میں دیا تھا، یہ فتویٰ زبانی دیا گیا تھا، جسے اس وقت تحریر میں نہیں لایا گیا تھا۔ تاہم وہ بڑے تواتر کے ساتھ علمائے الجزائر میں متداول چلا آ رہا ہے اور الشیخ محمد الفضیری جب وہ الجزائر کی جانب سے سعودی عرب میں سفیر تھے، تو وہ بھی اسی کے مطابق عمل کرتے اور کراتے تھے۔

(ج) اور اس مروجہ عمل کو سامنے رکھتے ہوئے کہ حجاج کو خود کبھی جانور کی قربانی دینے کی نوبت تک نہیں آتی۔ بلکہ وہ قربانی کی رقم معلموں، طواف کرانے والوں یا ان کے ملازمین کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کیونکہ حجاج کی کثرت کی وجہ سے ہجوم میں ہلاک ہونے کے خوف کی وجہ سے وہ نہ تو خود قربانی کے جانور خریدتے ہیں اور نہ ہی انہیں ذبح کر کے ان کا گوشت فقراء و مساکین میں تقسیم کرتے ہیں بلکہ رقم ان معلموں کے ملازمین کے حوالے کر دینا کافی سمجھتے ہیں (جو معلوم نہیں ان کی جانب سے قربانی دیتے بھی ہیں یا نہیں۔)

(د) اور شریعتِ اسلامیہ کے اس مشہور اصول پر عمل کرتے ہوئے کہ مفاد حاصل کرنے سے پہلے مفاسد کا دُور کرنا ضروری ہے اور اس حقیقت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُمتِ مسلمہ کے مصالح کے لئے اور اس سے مفاسد کو دُور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ قربانی کی یہ دولت مٹی میں دفن ہو کر ضائع ہونے کی بجائے فقراء اور مساکین میں تقسیم ہو اور دوسرے نیکی کے کاموں پر خرچ ہو۔

مجلسِ افتاء کے نزدیک ان حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے قربانی کے جانور کی نقد قیمت مکہ مکرمہ کے غریب و نادار مسلمانوں کو دینی بھی جائز ہے اور نیکی کے دوسرے کاموں پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے اور یہ فتوے الجزائر کے حجاج کے لئے شرعی حیثیت رکھتا ہے اور وزارتِ تعلیم اصلی اور امورِ دینیہ اس فیصلے کا اعلان کرتی ہے کہ وہ اس فتویٰ کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر عمل کرنے کی وصیت کرتی ہے۔

(روزنامہ الشعب الجزائر ۲۹-۶-۹۵ھ)

ہمارے ہاں علمائے عرب کے ان اقوال کی تو خوب خوب تشہیر کی جاتی ہے جن کا تعلق کسی کی ذات سے ہو۔ جیسا کہ ہم علامہ الشیخ بشیر الابراہیمیؒ کے سلسلے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ لیکن ان کے جن فیصلوں سے ملتِ اسلامیہ کے لاکھوں افراد متاثر ہوتے ہیں، ان پر جان بوجھ کر پردہ ڈال دیا جاتا ہے — جیسا کہ فتویٰ زیرِ بحث کے سلسلے میں کیا گیا ہے اور جو عرب دنیا کے اکثر و بیشتر رسائل و جرائد میں شائع ہوا ہے۔ یہاں تک کہ رابطہ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کے ترجمان اخبار العالم الاسلامی تک میں چھپ چکا ہے۔ اس فتویٰ سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن امتِ مسلمہ کے ایک کثیر حصہ کو جو عربی زبان سے نابلد ہے اس سے محروم رکھنا قرینِ انصاف نہیں۔ اسی ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم نے اس کا تعارف کرایا ہے۔ اور مزید یہ کہ ہمارے پاکستانی قارئین کو معلوم ہو سکے کہ علمائے عرب میں جمود ٹوٹ چکا ہے اور وہ اہم دینی مسائل میں اُمتِ مسلمہ کے مفاد کو مقدم رکھتے ہیں۔

طلوعِ اسلام اس قسم کے اقدامات اس حقیقت کے شواہد ہیں کہ زمانے کے تقاضے کس طرح ذہنوں کا رُخ قرآن کی طرف موڑتے چلے جا رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ مسلمان قرآنِ کریم میں بیان کردہ اس حقیقت تک پہنچ جائے گا کہ حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے کا مقصد یہ تھا کہ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ۔ (۲۲/۳۶) انہیں خود بھی کھاؤ اور دیگر اہلِ حاجت کو بھی کھلاؤ۔

باسمہٖ تعالیٰ

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(موجودہ عالمگیر فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کا حقیقی سبب
اور اس کا علاج)

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں
پرویز صاحب کا خطبۂ استقبالیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدائے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

رفیقانِ محترم و زمیلانِ گرامی قدر!.... السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یہ حقیقت کس قدر مسرت انگیز اور وجد آفریں ہے کہ سالِ گذشتہ کی طرح امسال بھی جشنِ نزولِ قرآن اور جشنِ تذکارِ قرآن (یعنی عیدالفطر اور طلوعِ اسلام کنونشن) ہم ردیف ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، جسے عیدالفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزولِ قرآنِ مجید ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تاریخِ انسانیت میں، عظیم انقلاب آفریں ساعتوں کا مہبط ہے۔ قرآن کریم جو انسانی زندگی کی شبِ تیرہ و تاریک میں آفتابِ جہاں تاب کی نمود ہے۔ اس کے نزول کا آغاز بھی اسی ماہ ہوا۔ حق و باطل کا وہ معرکہ جسے خود خدا نے فرقان سے تعبیر کیا ہے۔ ۱۷ رمضان کو بدر کے مقام پر برپا ہوا۔ اس معرکہ کی اہمیت و عظمت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ عین میدانِ جنگ میں، جب فریقین ایک دوسرے کے بالمقابل صف آراء ہو چکے تھے۔ حضور نبی اکرمؐ نے دل کے پورے سوز و گداز کے ساتھ، اپنے رب کو یہ کہہ کر پکارا تھا کہ اس آسمان کے نیچے یہ تین سو تیرہ نفوس ہیں جو تیرا نام بلند کرنے کے لئے اس وقت جان کی بازی لگا رہے ہیں۔ اگر انہیں شکست ہو گئی تو پھر دنیا میں قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا ــــ اور اس کے بعد فتح مکہ جو اس سلسلۂ تصادمات کی آخری اور فیصلہ کن کڑی تھی، اس کے چھ سال بعد (۸ھ میں) اسی ماہ رمضان کی دس تاریخ کو ظہور میں آئی تھی۔ غور کیجئے کہ کیا عالمِ انسانیت کے لئے جشنِ مسرت کی اس سے بڑھ کر کوئی اور تقریب بھی ہو سکتی ہے؟ یہ تو اقوامِ عالم کی بھول، اور خود ہماری کوتاہ اندیشی ہے جو اس جشن کو مسلمانوں تک محدود کر لیا گیا ہے۔ جس دن انسانیت کی آنکھ کھلی وہ دیکھ لے گی کہ جس طرح سورج کسی خاص ملک، خاص قوم، یا خاص مملکت کے لئے وجہِ تابانی نہیں ہوتا، کرۂ ارض پر بسنے والی تمام مخلوق کے لئے سرچشمۂ نور ہوتا ہے، اسی طرح رمضان المبارک بھی کسی خاص قوم کے لئے جشنِ انقلاب کی تمہید نہیں۔ جس طرح

قرآن کا بھیجنے والا، رب العالمین۔ اس کا لانے والا رحمت اللعالمینؐ، اور خود قرآن ذکر اللعالمین ہے۔ اسی طرح یہ مہینہ اور اس کے اختتام پر جشنِ عید میں تمام نوعِ انسان کے لئے، صدہا شادمانیوں کی نوید اور ہزارہا کامرانیوں کی نشید ہے۔ یہی وجہ ہے جو اللہ تعالےٰ نے اس جشن کے تعارف کے لئے خطاب بھی نوعِ انسان سے کیا ہے، جب کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (۱۰/۵۷-۵۸)
اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے نشوونما دینے والے نے ایک ایسا ضابطۂ زندگی بھیجا ہے جو تمہارے تمام دکھوں کی دوا ہے، اور ہدایت اور رحمت ہے ان کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ وہ نعمتِ کبریٰ ہے جو تمہیں بلا مزد و معاوضہ، محض خدا کے فضل و رحمت سے مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ اس تمام متاعِ حیات سے زیادہ قیمتی ہے، جسے انسان اپنے لئے جمع کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن تمام نوعِ انسان کے لئے زندگی کا پیغام اور کامرانیوں کی نوید ہے۔ اس کا ہر لفظ زندہ حقیقتوں کا عنوان ہے۔ اس کا اعجاز یہ ہے کہ ؎

جس شے پہ نظر پڑی ہے اس کی تصویرِ حیات ہو گئی ہے

اور کس قدر مستحقِ صد تبریک اور سزاوارِ ہزار تہنیت ہیں آپ احباب جو دنیا کی تمام کششوں اور جاذبیتوں سے منہ موڑ کر، اور دور دراز کی مسافتیں طے کر کے، اس کتابِ عظیم کے جشنِ تذکار میں شمولیت کے لئے حسین آرزوؤں اور بے لوث تمناؤں کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے، ہر سال، کشاں کشاں یہاں چلے آتے ہیں۔ یہ سنتِ ابراہیمیؑ کا اتباع ہے، جس میں انہوں نے زندگی کے ہر گوشے کا بنظرِ غائر مطالعہ اور مشاہدہ کرنے کے بعد بکمالِ جہد و کیف اعلان کیا تھا کہ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۶/۷۹) میں نے، دنیا کے ہر گوشے سے منہ موڑ کر، اپنی توجہات کا مرکز اس خدا کے متعین کردہ نظام کو قرار دے لیا ہے جو کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ یہی وہ توحید ہے جس میں شرک کا شائبہ تک نہیں۔ اور یہی وہ جذبہ ہے، جسے دل میں لئے، آپ یہ کہتے ہوئے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ۔

حرم کو چھوڑ کے پیرِ حرم کہاں جاؤں کہ میں تو دیر و کلیسا سے ہو کے آیا ہوں

اور اسی سرچشمۂ حیات اور وجہِ ثباتِ کائنات کا تصور اور اس کی صداقتوں پر یقین ہے، جو تباہیوں اور بربادیوں کے اس قدر ہجوم اور عالمگیر مایوسیوں اور ناامیدیوں کے ازدحام میں مجھے نہ پُرملال و محزول ہونے دیتا ہے نہ مایوس و ناامید ؎

خدا رکھے سلامت اس دلِ برباد و ویراں کو بیاباں میں لئے بیٹھا ہے اک جانِ گلستاں کو

عصرِ حاضر کی یہی عالمگیر تباہیاں اور بربادیاں ہیں جو عزیزانِ من! اس کنونشن کے استقبالیہ میں میرا موضوعِ خطاب ہیں۔

انسان نے جب سے تمدنی زندگی شروع کی، اس کے معاشرہ میں فساد اور خلفشار ساتھ ساتھ چلتا رہا ـــــ یہی قصۂ ابلیس و آدمؑ سے مقصود ہے ـــــ یہ معاشرتی خلفشار اکثر و بیشتر مقامی ہوتا تھا، یعنی کسی خاص قوم یا محدود خطۂ زمین کے اندر ـــــ لیکن بعض اوقات یہ وبائی امراض کی طرح عالمگیر حیثیت بھی اختیار کر لیتا تھا۔ ظہورِ نبی اکرمؐ کے وقت اس نے یہی عالمگیر حیثیت اختیار کر لی تھی جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ـ (۳۰/۴۱) "انسانی زندگی کے ہر گوشے میں فساد برپا ہو چکا ہے اور یہ سب انسانوں کا اپنا کیا کرایا ہے"۔ اُس زمانے میں متمدن دنیا کا بیشتر حصہ مملکتِ روما اور سلطنتِ ایران پر مشتمل تھا، اور تاریخ بتاتی ہے کہ ان دونوں میں اخلاقی خرابیاں انتہا تک پہنچ چکی تھیں۔ لہٰذا قرآن کریم جیسے عالمگیر مطالبۂ حیات کے نزول کا ٹھیک وہی زمانہ ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن موضوعِ پیشِ نظر کی رو سے ہمیں تاریخی صدیوں کے چودہ ورق الٹ کر دورِ حاضر میں پہنچ جانا چاہیئے جہاں اس فساد نے ایسی عالمگیر حیثیت اختیار کر رکھی ہے کہ دنیا کا کوئی ملک یا کوئی قوم اس سے محفوظ نہیں رہی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

نہ مشرق اس سے بُری ہے نہ مغرب اس سے بُری ۔۔۔ جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

اقبالؒ نے قلب و نظر کی اس رنجوری کا مطالعہ اپنے قیامِ یورپ کے دوران کیا اور اس کے بعد اقوامِ مغرب سے للکار کر کہا کہ یاد رکھو! ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی ۔۔۔ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

تہذیب سے مراد

اقبالؒ کے نزدیک تہذیبِ مغرب سے مراد کوٹ، پتلون، ٹائی یا میز کرسی اور چھری کانٹا نہیں تھے۔ تاریخِ مغرب کے مشہور نقاد سپنگلر نے کہا ہے کہ ایک چیز ہوتی ہے تصورِ حیات یا روحِ زندگی، اور دوسری چیز ہوتی ہے وہ مادی پیکر، جن میں اس تصوّر کی نمود ہوتی ہے۔ اس تصوّر یا روح کو کلچر کہا جاتا ہے اور اس کے مادی مظاہر کو تہذیب۔ لہٰذا جب اقبالؒ نے تہذیبِ مغرب کو "شاخِ نازک" قرار دیا تھا تو اس سے ان کی مراد وہ نظریۂ حیات تھا جس پر مغربی تمدن کی پوری عمارت اٹھی تھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ نظریۂ حیات کیا تھا۔ اس لئے کہ جب تک یہ بنیادی نکتہ واضح نہیں ہوگا یہ بات سمجھ میں نہیں آسکے گی کہ اقبالؒ نے جو تہذیبِ مغرب کی اس قدر مخالفت کی تھی اور اسے اسلام کے یکسر خلاف ابلیسی نظام قرار دیا تھا، اس کی وجہ کیا تھی اور یہی درحقیقت میرے آج کے خطاب کا مرکز اور محور ہے، بالخصوص اس لئے کہ اسی سے ہم یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ خود ہمارا ملک بھی جو کشاں کشاں تباہی کے جہنم کی طرف کھنچے چلا جا رہا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟

سولھویں صدی عیسوی میں سائنٹفک تحقیقات کی ابتداء ہوئی۔ قرآنِ کریم نے تسخیرِ کائنات کو آدم کی خصوصیت بتایا تھا اس لئے یورپ کے سائنسدانوں کی کوششیں اور کاوشیں اس مقصد کے حصول کی طرف صحیح اقدام تھیں۔ لیکن مادی کائنات کے رموز و اسرار کی جستجو کرتے کرتے خود انسان کے متعلق وہ جس نتیجہ پر پہنچے وہ یکسر باطل تھا۔ انہوں نے کہا یہ کہ انسان، حیوانات

مادی نظریۂ حیات

ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ اس کی زندگی بھی دیگر حیوانوں کی طرح محض طبیعی زندگی ہے اور اس کے تقاضے بھی روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ سے بیشتر کچھ نہیں۔ اگر اس کی طبیعی زندگی کے یہ تقاضے پورے ہو جاتے ہیں، تو زندگی کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد جب طبیعی قوانین کے تابع انسان پر موت وارد ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسے میکانکی یا مادی نظریۂ حیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر یہ تحقیق صرف سائنس کی لیبارٹریز تک محدود رہتی تو اس کی حیثیت ایک سائنٹفک عقیدے سے زیادہ کچھ نہ ہوتی۔ لیکن یہاں ایک اور دشواری نے سر ابھارا، جسے مشہور مغربی مفکر الیف۔ جے۔ شین نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> یہ ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق تاریخ سے کی جا سکتی ہے کہ جب کبھی سائنٹفک زاویۂ نگاہ میں کوئی بڑی تبدیلی واقعہ ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایسے مفکر پیدا ہو جاتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بنیادی اور ابدی صداقتوں میں بھی اُسی زاویۂ نگاہ کے مطابق تبدیلی پیدا کر دی جائے۔ جب اٹھارویں صدی میں نیوٹن کے نظریہ کے ماتحت عالمِ آفاق کے متعلق نیا تصور قائم ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس کا بھی تقاضہ شروع ہو گیا کہ اب دنیا کو مذہب بھی نیا ملنا چاہیئے۔ چنانچہ اس کے مطابق ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا۔ جس کی رُو سے مطالبہ یہ کیا گیا کہ اخلاقیات، ادب اور مابعد الطبیعیات کو اپنے بنیادی اصول اور جوہر بدل لینے چاہئیں، تاکہ وہ اس سائنٹفک زاویۂ نگاہ کے مطابق ہو جائیں۔

سیکولر نظریۂ حیات

اس نئے مذہب کو سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا امام آٹلی کا مشہور مدبّر میکیاولی تھا۔ سیکولرازم کے متعلق عام طور پر اتنا ہی سمجھا جاتا ہے کہ اس سے مراد مذہب کو سیاست سے الگ کر دینا ہے، اور چونکہ مذہب سے مراد چند عقائد، چند مقدس رسوم، پوجا پاٹ یا پرستش کے طور طریق یا زیادہ سے زیادہ شخصی قوانین (پرسنل لاز) لئے جاتے ہیں۔ اس لئے سطحی نقطۂ نگاہ سے مذہب اور سیاست کی اس ثنویت کو نہ صرف ناقابلِ اعتراض قرار دیا گیا، بلکہ معقول بھی سمجھا گیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ یورپ میں کلیسائی نظام (چرچ کی نولادی تنظیم) نے ایسی قوت اختیار کر لی تھی کہ لوگ اُس کی آہنی گرفت سے تنگ آ چکے تھے اور کسی نہ کسی اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ مذہب اور سیاست کی اس علیحدگی سے یہ مقصد بھی حاصل ہو گیا، اس لئے سیکولرازم کا استقبال ہر جگہ نہایت خندہ پیشانی سے کیا گیا۔ یہ تو سیکولرازم کا سطحی سا مطالعہ ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے اثرات بڑے دُور رس ہیں۔ اس سے حقیقی مراد یہ ہے کہ انسان کی تمدنی، معاشرتی، سیاسی، معاشی زندگی

کے لئے کوئی مستقل اصول اور غیر متبدل اقدار متعین نہیں۔ انسانی سوسائٹی اپنے لئے خود اصول اور اقدار متعین اور ان میں حسبِ منشا تغیر و تبدل کر سکتی ہے۔ مذہب کو اپنی رہنمائی کے لئے ہدایتِ خداوندی کی ضرورت ہو تو ہو، انسان کی تمدنی زندگی میں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان اپنے مسائل کا حل خود تلاش کر سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ سیکولرازم سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی کسی ایسے غیر متبدل ضابطۂ اخلاق و اقدار کی پابند نہیں کی جا سکتی جس کا سرچشمہ عقلِ انسانی سے ماورا ہو۔ انہوں نے کہا تو یہ کہ ان اقدار و اصول کی امورِ سیاست و معیشت وغیرہ کے لئے کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اس نظریہ کا عملی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مذہب میں بھی ان اقدار کی کوئی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ مذہب میں اگر فقہی احکام یا پرستش وغیرہ سے متعلق ارکان و رسوم کی ادائیگی، میکانیکی طور پر کر لی جائے۔ تو اس کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جن لوگوں کو پابندِ شریعت کہا جاتا ہے اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ مذہبی پیشوائیت کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق فقہی احکام و رسوم ادا کرتے رہتے ہیں۔ اقدار کی پابندی کا سوال وہاں بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اقبالؒ نے جو کہا تھا۔

کہ دلبری بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اقدار کی پابندی کا سوال نہ دنیائے مذہب میں پیدا ہوتا ہے نہ عالمِ سیاست میں۔

میکیاولی سیاست

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ سائنٹفک تحقیق کی رو سے انسان کے متعلق میکانیکی نظریۂ حیات پر مبنی جو مذہب پیدا ہوا اس کا امام میکیاولی تھا۔ اس نے ملکت اور برسرِ اقتدار طبقہ کے لئے کچھ نظریات وضع کئے جنہیں اس نے اپنی مشہور کتاب (THE PRINCE) میں منضبط کیا ہے۔ اس میں (مثلاً) وہ کہتا ہے۔

> بادشاہ کے لئے لومڑی کی صفت نہایت ضروری ہے، تاکہ وہ دجل و فریب کے جال بچھا سکے۔ اس کے ساتھ خوگے شیری بھی تاکہ وہ بھیڑیوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں۔ اس لئے عقل مند بادشاہ وہ ہے کہ جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے، یا جن وجوہات کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا، وہ باقی نہیں رہیں، تو اُسے بلا تامل توڑ ڈالے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نگاہ فریب دلائل بہم پہنچائے جائیں۔ (اٹھارواں باب)

وہ دوسرے مقام پر لکھتا ہے۔

> جو بادشاہ اپنے پاؤں مستحکم رکھنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ بدی کس طرح کی جاتی ہے اور اس کے لئے کونسا وقت سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس میں خوبیوں کا ہونا ضروری نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ بظاہر معلوم ہو کہ اس

میں خوبیاں موجود ہیں۔ بظاہر ایسا دکھائی دے کہ وہ بڑا رحمدل، وفاشعار، نیک اطوار، مذہب پرست، صداقت پسند ہے۔ اس میں چنداں مضائقہ نہیں کہ اس میں ان میں سے کوئی خوبی سچ مچ پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے دل کی حالت ہمیشہ ایسی رہے کہ جونہی وہ دیکھے کہ مصلحتِ وقت کا تقاضہ ہے کہ اس کی اس خوبی کو یکسر الگ کر دیا جائے تو وہ بلا تامل و توقف اس کے خلاف عمل کر سکے۔　　　(اٹھارواں باب)

میکیاولی کی یہ کتاب سولھویں صدی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے نظریۂ سیاست نے کس قدر مقبولیت حاصل کی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس وقت سے آج تک یہ کتاب مغربی سیاست میں "کتابِ مقدس" کی حیثیت رکھتی ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے فرمانروا اس کتاب کو سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کرامویل (CROMWELL) اسے اپنے تکیہ کے نیچے رکھ کر سویا کرتا تھا۔ ہنری سوم اس "نسخۂ کیمیا" کو ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ جب وہ قتل ہوا ہے تو اس وقت بھی اس کی جیب سے یہ کتاب نکلی تھی۔ بیکن لکھتا ہے کہ:-

> ہم میکیاولی اور اس جیسے دیگر مفکرین کے احسان مند ہیں جنہوں نے ہمیں یہ سکھایا کہ آدمی کو کام کرنا چاہیئے، یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ اس کا اخلاقی فریضہ کیا ہے۔

المختصر، اس تین چار سو سال کے عرصہ میں سیکولرازم نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ اب یہ اقوامِ یورپ ہی کا نہیں، ساری دنیا کا نیا مذہب قرار پا چکا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اگر کسی شخص کے دل میں اخلاقی اقدار کی پابندیوں کا خیال ابھرتا ہے تو اس کے متعلق سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ امورِ مملکت سرانجام دینے کا اہل ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ڈال تپرل نے لکھا ہے کہ:-

> نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو نہیں بچا سکے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے، نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔ (IDEALS AND ILLUSIONS P. 14)

اور لارڈ گرے نے کہا تھا کہ:-

> سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رو سے طے نہیں پا سکتے۔ (ایضاً ص۱۳)

اس سیکولرازم میں مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا گیا تھا، لیکن مذہب کا وجود بہرحال باقی تھا اور وہاں سے کم از کم اخلاقی اقدار کی آواز بلند ہوتی رہتی تھی۔ اگرچہ اس کی حیثیت وعظ یا ——— (SERMON) سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی تھی۔ چونکہ یہ وعظ بعض حد اس قلوب میں کھٹک کا موجب بنتے تھے اس لئے ان کی تسکین کے لئے وہاں پرائیویٹ زندگی اور پبلک زندگی میں امتیاز کا نظریہ پیدا ہوا۔ پرائیویٹ زندگی کیلئے اور ضابطۂ حیات تھا اور پبلک زندگی کے لئے کچھ اور۔ یہ وہ ثنویت تھی، جس کے پیشِ نظر اقبال نے مذہب

(CAVOUR) نے کہا تھا کہ:-

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔ (نارتن افیئرز جولائی ۱۹۵۲ء)

اس صورت میں بھی مذہب کوئی مثبت کردار ادا کرنے کے قابل ہو یا نہ ہو، اس سیکولرازم میں اس کے وجود کو بہرحال برداشت کر لیا گیا تھا۔ لیکن انیسویں صدی میں یورپ میں ایک اور تحریک اٹھی جس کا بانی مشہور اشتراکی فلاسفر مارکس تھا۔ اس نے اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ خدا، وحی، مذہب، مستقل اقدار سب فریب ہیں۔ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ:-

مذہب انسان کی پیداوار ہے۔ انسان مذہب کی پیداوار نہیں۔ مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے جو یا تو ابھی تک اپنے مقامِ انسانیت سے بے خبر ہو یا جس نے اس مقام کو پا کر اسے پھر سے کھو دیا ہو۔ مذہب، مظلوموں کی سسکیاں، ایک پتھر کی دنیا کا قلب اور ان حالات کی روح ہے جو خود روح سے محروم ہیں۔ مذہب کی فنا میں حقیقی انسانی مسرت کا راز پنہاں ہے۔ اخلاقیات، مذہب، مابعدالطبیعیات اور دیگر تمام تصورات حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ مادی انسان کی ہے۔

(CRITIQBE OF THE PHILOSOPHY OF LAW OF HEGEL)

اخلاقیات کے متعلق مارکس کا اوّلین متبع لینن کہتا ہے:-

ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی فوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے، دھوکہ ہے۔ یہ تصور زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر، محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے مفاد کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطۂ اقدار کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ حیات احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ ہم خدا کو مانتے ہی نہیں۔ اخلاق، انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے۔ اس سے ماوراء جو کچھ ہے، فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔

(MARX _ HEGEL _ MARXISM _ P. 461 - 465)

سیکولرازم کے اس ایڈیشن کا نام کمیونزم یا سوشلزم ہے۔ واضح رہے کہ کمیونزم یا سوشلزم میں صرف معاشی نظام کے مدارج کا فرق ہے۔ سوشلزم اس کے عبوری دَور کا نام ہے اور کمیونزم انتہائی سطح کا جس کا

حصول خود مارکس کے نزدیک ناممکن ہے۔ لیکن جہاں تک نظریاتِ زندگی کا تعلق ہے ان دونوں کی بنیاد اسی تصور پر ہے جسے میں نے مارکس اور لینن کے الفاظ میں ابھی ابھی پیش کیا ہے۔ ضمناً میں ان، اور اسی قسم کے دیگر اقتباسات کو اس سے پہلے بھی متعدد بار پیش کر چکا ہوں اور اس کنونشن کے میرے ہر خطاب میں انہیں دہرایا جاتا رہے گا۔ میں اس کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا اس لئے کہ (جیسا کہ میں آگے چل کر بیان کروں گا) آجکل خود پاکستان میں سوشلزم کا بڑے شدّومد سے پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اور میں اپنے ایمان کا تقاضہ سمجھتا ہوں کہ قوم کو تباہیوں کے اس سیلاب سے متنبّہ کرتا رہوں۔ ان نظریات کے بار بار دہرانے کا مقصد بھی یہی ہے۔

بہر حال یہ ہے وہ سیکولرازم جو اس وقت دنیا کے ہر گوشے میں پھیل چکی ہے۔ اس سے نہ مسلمانوں کے ممالک محفوظ ہیں نہ غیر مسلموں کے۔ اس کا نتیجہ کیا ہے، وہ مجھ سے نہیں، خود یورپ کے مفکرین سے پوچھئے!

مفکرینِ مغرب کا داویلا

لارڈ رسل نے ۱۹۴۷ء میں اپنی آخری کتاب (THE NEW WORLD) شائع کی تھی۔ اس میں اس نے لکھا ہے:-

> نوعِ انسان کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔۔۔۔ یوں تو انسان کی طول طویل تاریخ میں بہت سے حوادث آئے ہیں، لیکن موجودہ حادثہ نہ صرف ان سے وسعتوں اور پہنائیوں میں بڑا ہے بلکہ یہ ان سب سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے۔ پہلے حوادث خاص خاص خطوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور متعین مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔۔۔۔۔ لیکن گذشتہ جنگ (یعنی دوسری جنگِ عظیم) کو دیکھئے۔ اس کی ظلمت انسانی قلوب کی گہرائیوں میں دکھائی دے گی۔۔۔۔ اس سے پہلے منظم شر کی قوتیں کبھی اس قدر زور آور نہیں ہوئی تھیں۔ اب تو ان سے نجات کا راستہ ہی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔۔۔۔ انسانیت اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں سے کچلی جا رہی ہے۔ تباہ ہو رہی ہے۔۔۔۔ ہر جگہ اخلاقی شکست کا اندوہناک احساس، انسانی قلوب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ (صفحہ ۲۰۳)

آپ نے غور فرمایا کہ سیکولرازم کے نظریہ نے کس قدر عالمگیر تباہیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس کی پیدا کردہ یہی ابلیسیت تھی، جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا ؎

> تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ   مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
> بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے   بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

مفکرینِ مغرب اس اعتراف پر مجبور ہو رہے ہیں کہ یہ سب کچھ اُس تہذیب کا پیدا کردہ ہے جسے اقبالؒ نے ساٹھ ستّر برس پہلے "شاخِ نازک" قرار دیا تھا۔ مثلاً مغرب کا نامور مؤرخ اور مفکر رابرٹ بریفو اپنی کتاب

THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے:-

یہ جنگ معہ اپنے تمام بہیمانہ مظاہروں کے، جن کی وجہ سے آج ہمارا شعور، گوناگوں دہشت انگیز پریشانیوں کا مسکن بن رہا ہے، کوئی ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ یہ تمام مجرمانہ حماقتیں، یہ تمام منافقتیں، تہمت تراشیاں اور دروغ بافیاں، یہ تمام سنگدلانہ حرکات، انسانی زندگی، قوت اور دولت کی یہ تمام بربادی اور دہشت انگیز تباہی، غرضیکہ یہ پورے کا پورا پاگل پن اور اس کا ایک ایک عنصر ہماری قبل از جنگ کی مغربی تہذیب کے اندر موجود تھا۔ جنگ دراصل ان تمام مذموم افعال اور نفرت انگیز اعمال کا مرئی اظہار یا مادی مظاہرہ تھا جن کی مسموم فضا میں ہم گھرے ہوئے تھے جنگ نے صرف اتنا ہی کیا کہ ان بھیانک چہروں سے نقاب الٹ دیا۔ (صفحہ ۳۶۰)

اس سلسلہ میں تہذیب کے مشہور امریکی مؤرخ (DORSEY) کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ وہ کہتا ہے:-

ہماری تباہی کا باعث نہ تو بڑے بڑے مجرم ہیں جن سے ہم لرزاں رہتے ہیں اور نہ ہی وہ افلاس جس سے ہم نادم ہیں۔ اس کا اصلی باعث وہ معاشرتی نظام ہے جو منافقت اور فریب کی بنیادوں پر قائم ہے اور اس کے ساتھ یہ قانون کہ جس کی لاٹھی، اس کی بھینس۔ (CIVILIZATION P 87)

اور یہی ہے وہ سیکولرازم جو مملکتِ پاکستان میں سیلاب کی طرح امڈے چلا آ رہا ہے۔ پہلے یہ مغرب کے جمہوری نظام کی شکل میں تھا۔ اب اس کے ساتھ سوشلزم کا نظریہ بھی اُسی شدّ و مد سے پھیلایا جا رہا ہے۔ "مذہب، اسلام۔ سیاست، جمہوریت۔ اور معیشت، سوشلزم"۔ اسی سیکولرازم کے اقنوم ثلاثہ ہیں۔ ہمارے دستور میں یہ درج ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہے۔ اقتدار ایک امانت ہے جسے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے استعمال کیا جائے گا۔ اور یہاں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف وضع نہیں ہو سکے گا۔ لیکن ان کی حیثیت اتنی ہی ہے جتنی ہر سیکولر نظام میں مذہب کی ہوتی ہے۔ یہاں کوئی ادارہ ایسا قائم نہیں کیا گیا، جس سے یہ فیصلہ لیا جا سکے کہ حکومت کا کاروبار فی الواقعہ خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پا رہا ہے۔ نہ کوئی معیار ایسا تجویز کیا گیا ہے جو یہ بتا سکے کہ مملکت کے قوانین و ضوابط، کتاب و سنت کے مطابق ہیں یا نہیں۔ یہاں بھی خدا، رسول، مذہب کے الفاظ ہی ہیں، اور مذہب کی دنیا میں بھی الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کی تکرار کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ ہم نے ابھی ابھی رمضان المبارک کی راتوں میں ہر مسجد میں قرآنِ مجید کے الفاظ کو الحمد سے والناس تک دوہرایا ہے۔ امام نے ان الفاظ کو دہرایا ہے، مقتدیوں نے انہیں سنا ہے۔ لیکن آپ سینے پر ہاتھ رکھ کر خدا لگتی کہیئے کہ کیا خدا کی اس کتابِ عظیم کے الفاظ کے اس شدّ و مد سے دہرانے سے اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ہماری، رمضان سے پہلے اور رمضان سے بعد کی زندگی میں کوئی فرق بھی آیا ہے؟ جو نظریہ صرف

پاکستان میں سیکولرازم

الفاظ بن کر رہ جائے اور عملی زندگی میں وہ کارفرما نہ ہو۔ اس کے متعلق مشہور مفکر برگساں کہتا ہے:۔

> جو زندہ تصوّر محض الفاظ کے پیکر میں محبوس ہو جائے وہ بے حس و حرکت اور جامد بن کر رہ جاتا ہے۔ الفاظ اُس تصوّر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ حروف کے پیکر روح کو ذبح کر دیتے ہیں۔ ..... اگرچہ کچھ وقت تک یوں محسوس ہوتا رہتا ہے کہ وہ تصوّر زندہ ہے، جس طرح انسان کے مرجانے کے بعد کچھ وقت کے لئے اس کے چہرے کے خط و خال بدستور قائم رہتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ مرچکا ہوتا ہے۔ (CREATIVE EVOLUTION P.134)

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے، ہماری سیاست کی عمارت مغربی نظامِ جمہوریت کی بنیادوں پر استوار ہے جس میں اقتدارِ خداوندی کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ دوسری طرف ہماری مذہبی پیشوائیت کے نزدیک اسلامی نظام کا تصور، چند سزاؤں تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ سزائیں (تعزیرات) تو اس وقت تک مؤثر ہوتی ہیں جب جرائم مستثنیات میں داخل ہوں۔ جب یہ معاشرہ میں عالمگیر شکل اختیار کر لیں، تو پھر سزاؤں سے ان کی روک تھام نہیں ہو سکتی۔ ان کی روک تھام کا طریقہ ایک ہی ہے جسے قرآن کریم نے نفسیاتی تغیر کہہ کر پکارا ہے، اور جو نظریۂ زندگی اور اقدارِ حیات کے بدلنے کے بغیر ممکن نہیں۔ سیکولرازم میں نہ اقدارِ حیات کا تصوّر ہوتا ہے نہ ان کے مطابق نفسیاتی تغیر کا۔ یہی وجہ ہے جو ہماری تعلیم ایسے نوجوان پیدا کر رہی ہے جن کے نزدیک مستقل اقدار، توہم پرستی سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔

اس مقام پر مجھے ایک اور نقطہ کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبالؒ نے مملکتِ پاکستان کا تصور دیا تو، اور قائدِاعظمؒ نے اس تصور کو عملاً متشکل کرنے کے لئے جدوجہد کی تو، دونوں کا مطمحِ نگاہ یہی تھا کہ اس مملکت میں وحی پر مبنی مستقل اور غیر متبدل نظریاتِ زندگی اور اقدارِ حیات کارفرما ہوں۔ یہ کوئی پانچ دس ہزار سال پہلے کی بات نہیں، ابھی کل کی بات ہے۔ ہم میں ابھی تک ایسے افراد موجود ہیں جنہوں نے اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کے ارشادات کو اپنے کانوں سے سنا۔ اس کے ساتھ ہی اُن دونوں کی سینکڑوں ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی تقاریر، تحاریر منضبط اور محفوظ ہیں جن میں انہوں نے یہ بتایا تھا کہ یہ مملکت کیوں حاصل کی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود سیکولرازم (یعنی سوشلزم) کا پراپیگنڈہ کرنے والوں کی جراتوں اور بیباکیوں کا یہ عالم ہے کہ یہ بھرے مجمعوں میں کہتے پھرتے ہیں کہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ دونوں سوشلزم کے قائل تھے۔ میں اس پہلے بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ لیکن موضوعِ پیشِ نظر کا تقاضا ہے کہ ان میں سے دو چار نظائر اس وقت بھی پیشِ خدمت کر دوں جیسا کہ میں نے سوشلزم کے بانیوں کی تحریروں کے اقتباسات دے کر بتایا ہے، سوشلزم اس نظریۂ حیات کا نام ہے جس میں خدا، وحی، رسالت، آخرت کا انکار کیا جاتا ہے۔ اقبال اور قائدِاعظمؒ نظامِ سرمایہ داری کے مخالف تھے، اس لئے کہ قرآنِ کریم خود اس نظام کا سخت مخالف ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ

سوشلزم کے نظریۂ حیات کے قائل تھے۔

علامہ اقبالؒ اور سوشلزم

پہلے علامہ اقبالؒ کو لیجئے۔ یہ معلوم ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں ان کا خصوصی موضوع فلسفہ تھا۔ لیکن انہوں نے اس زمانہ کے ختم ہونے کے فوری بعد، جو سب سے پہلے کتاب لکھی وہ اقتصادیات سے متعلق تھی۔ اس کا نام ہی — "علم الاقتصاد" تھا، جو ۱۹۰۳ء میں اس وقت شائع ہوئی جب آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ یہ معاشیات میں، ہندوستان میں اُردو زبان میں سب سے پہلی تصنیف تھی اور اِسے بھی پیشِ نظر رکھئے کہ اس وقت علامہ اقبالؒ کی عمر کیا تھی۔ وہ اِس کتاب میں لکھتے ہیں:۔

> خوراک، لباس، مکان، ہماری زندگی کے لئے ضروری ہیں لیکن ان کی قدر اِن مقاصد کی قدر پر منحصر ہے جن کو یہ پورا کرتے ہیں۔ مگر زندگی کے اِن معمولی مقاصد کی اصل وقعت صرف اس صورت میں معلوم ہو سکتی ہے جب ہم ان پر زندگی کے افضل ترین مقصد کے لحاظ سے غور کریں۔ اس لئے علم الاقتصاد کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے اِسی قدر مطالعہ علم الاخلاق کا بھی ضروری ہے۔ اکثر مصنفین نے اس صداقت کو محسوس نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت بلالحاظ زندگی کے افضل ترین مقصد کے بجائے خود ایک مقصد تصوّر کی گئی۔ جس سے بعض تمدّنی اصلاحوں کے ظہور پذیر ہونے میں بے جا تعویق ہوئی اور دولت سے پیار کرنے والوں کی حرص و آز پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ (صفحہ ۲۱)

اِس کے بعد انہوں نے واضح کیا ہے کہ کسی چیز کی حقیقی قدر و قیمت اِس بات پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے۔ یعنی علامہ اقبالؒ کے نزدیک، معیشت، مقصود بالذات نہیں، بلکہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور ان کے الفاظ میں "اگر یہ ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہم کو مدد نہیں دے سکتی تو یہ بے فائدہ ہے"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سوشلزم کے متعلق علامہ اقبالؒ کے خیالات معلوم کرنے کے لئے ان کی اوائل عمر کی اس اوّلین تصنیف کے یہ چند الفاظ ہی کافی قرار پا سکتے ہیں۔ لیکن آپ اس سے ذرا آگے بڑھئے۔ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے کہ شمس الدین نامی ایک صاحب نے، جو اس زمانے میں شائع ہونے والے مجلّہ "القلاب" کے مدیر تھے۔ روزنامہ زمیندار میں ایک مضمون شائع کیا کہ علامہ اقبالؒ اشتراکیت کے بہت بڑے مبلّغ ہیں۔ حضرت علامہؒ نے اس سے اگلے ہی دن اس کے اِس مضمون کی بڑی سختی سے تردید کی اور لکھا کہ:۔

> کسی صاحب نے، کسی اخبار میں، میری طرف بالشویک خیالات منسوب کئے ہیں۔ چونکہ بالشویک خیالات رکھنا، میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے اِس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی

امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ (زمیندار ۲۴ جون ۱۹۲۳ء)

یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے۔ ۱۹۳۶ء میں غلام السیدین مرحوم نے، اسی موضوع پر علامہ کو ایک خط لکھا جس کا انہوں نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو جواب دیا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات اور مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظِ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں ــــ مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا..... جو روحانیت افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ (مکاتیبِ اقبالؒ۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۳۱۹)

ان اقتباسات کی روشنی میں آپ خود سوچئے کہ علامہ اقبالؒ کو سوشلزم کا مؤید کہنا کتنی بڑی جرأت اور ان کے خلاف کتنا بڑا سنگین الزام ہے۔ اسی خط میں آگے چل کر انہوں نے لکھا۔ "باقی رہا سوشلزم سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔" یہی وہ لفظ ہے جسے ہمارے ہاں کے نام نہاد انقلابی لئے لئے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے اقبالؒ نے خود اسلام کو سوشلزم کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جب علامہ اقبالؒ یہ کہتے ہیں کہ بالشویک خیالات رکھنا مسلمان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے تو کیا وہ اشتراکیت کو اسلام قرار دے سکتے ہیں؟ اور وہ بھی ایک ہی خط میں! ظاہر ہے کہ یہاں سوشلزم سے ان کی مراد سوشل جسٹس یا عدلِ عمرانی ہے، جو اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ قائدِ اعظمؒ کے نام ایک خط میں انہوں نے اسے 'سوشل ڈیماکریسی' کہہ کر بھی پکارا ہے۔ یہ خط انہوں نے ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:۔

اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے "سوشل ڈیماکریسی" کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے 'سوشل ڈیماکریسی' کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا، جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے اسلام میں کسی تبدیلی کے مترادف نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں، جیسا کہ یہ شروع میں تھا۔

اس سے آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے 'سوشلزم' اور 'سوشل ڈیماکریسی' یا 'سوشل جسٹس' میں کیسے واضح الفاظ میں خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے۔ سوشلزم وہ نظریۂ حیات ہے جس سے مسلمان، علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں، دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ لیکن 'سوشل جسٹس' یا 'سوشل ڈیماکریسی' اسلام کا عدلِ عمرانی ہے۔

یعنی بالفاظِ دیگر، قرآن کا معاشی نظام۔ انہوں نے اپنے کلام میں جا بجا اس کی وضاحت کی ہے۔ وہ کارل مارکس پر شدید ترین تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس! بر مساواتِ شکم دارد اساس

اور یہی وہ باطل اساس ہے، جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ جاوید نامہ میں روسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے جستۂ او را اساسِ محکمے؟

یہ اساسِ محکم کہاں سے ملے گی۔ اسے بھی سُن لیجئے۔

داستانِ کہنہ شستنی باب باب فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

یعنی تم نے قدیم تصورات کو تو ایک ایک کرکے مٹا دیا۔ لیکن یہ تو صرف حصۂ لا ہے۔ تخریب ہے۔ سلیٹ کو صاف کرنا ہے۔ اب اس کے بعد 'اِلّا' کی بھی ضرورت ہے۔ یہ تمہیں خدا کی کتابِ عظیم، قرآنِ مجید سے ہی مل سکتی ہے۔

یہ تھا اقبالؒ کا ایمان اور سوشلزم کے متعلق اُن کا عقیدہ۔ یہ ازم نوعِ انسانی کے لئے کس قدر تباہیوں کا موجب ہے۔ اس کے متعلق ان کا وہ پیغام ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے "سالِ نو کے پیغام" کے عنوان سے اقوامِ عالم کو مخاطب کرتے ہوئے یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر فرمایا تھا۔ یعنی اپنی وفات سے تین چار ماہ پیشتر۔ اس میں انہوں نے کہا تھا۔

> ہمارا موجودہ زمانہ، اپنی علمی ترقیوں اور بے مثال سائنٹفک معلومات پر بڑا فخر کرتا ہے۔ اور اس کا یہ فخر حق بجانب بھی ہے ..... لیکن ان تمام ترقیوں کے باوجود استعمار کا استبداد، ڈیماکریسی، نیشنلزم، کمیونزم، فاشزم اور خدا جانے کون کون سے ازم کا لقاب اوڑھے کرۂ ارض پر گردن اٹھائے پھر رہا ہے۔ ان نقابوں کے قریب میں، زمین کے ہر گوشہ میں، روحِ حریت اور احترامِ آدمیت اِس انداز سے پامال ہو رہے ہیں جس کی مثال تاریخِ انسانیت کے کسی تاریک ترین دَور میں بھی نہیں مل سکتی ..... ان 'ازمز' کے علمبردار سیاستدانوں نے کمزور اقوام پر تغلب حاصل کرنے کے بعد ان کی مقبوضات، ان کے مذہب، ان کے اخلاق، ان کی ثقافتی روایات اور ان کے لٹریچر تک کو اُن سے چھین لیا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اپنی زندگی کے اس آخری خطاب میں علامہ اقبالؒ نے کمیونزم کا شمار کس زمرے میں کیا ہے۔ اور اسے نوعِ انسان کے لئے کس قدر تباہی اور بربادی کا موجب قرار دے رہے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کو زیب دیتا ہے کہ وہ انہیں سوشلزم کے حامی ہونے کے الزام سے مطعون کر سکے؟

قائدِ اعظمؒ اور سوشلزم

اب آیئے قائدِ اعظمؒ کی طرف! علامہ اقبالؒ کی طرح وہ بھی نظامِ سرمایہ داری کے سخت دشمن تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی کے سیشن میں برملا اعلان کیا تھا کہ:-

> اِس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رو سے، جو انسان کو ایسا مدہوش کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں، جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے۔ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے۔ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر اِن سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

آپ نے دیکھا کہ قائدِ اعظمؒ، نظامِ سرمایہ داری کے کس قدر دشمن تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے کبھی سوشلزم کا نام نہیں لیا۔ ان کے بیانات، خطابات اور تقاریر میں جو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہیں، کہیں سوشلزم کا لفظ تک نہیں ملے گا۔ اِس کے برعکس انہوں نے ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد دکن میں نوجوان طالب علموں کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا:-

> اشتراکیت، بالشویت یا اِسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، درحقیقت اسلام اور اُس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی شکلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔

یہ ۔۔۔ اسلامی نظام ہی تھا جس کی رُو سے وہ پاکستان کے معاشی مسائل کا حل دریافت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جولائی ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا (اور میرا خیال ہے کہ یہ ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی۔):-

> ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی

> تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے گا اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔

آپ سوچئے کہ کیا دنیا کو یہ پیغام دینے والا سوشلزم کا حامی ہو سکتا تھا؛ اِن کی زبان پر ایک مرتبہ "اسلامی سوشلزم" کے الفاظ ضرور آئے تھے۔ وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد پہلی بار چاٹگانگ تشریف لے گئے تو وہاں کی پبلک نے انہیں ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو ایک استقبالیہ دیا۔ اس استقبالیہ میں جو ایڈریس پیش کیا گیا وہ تو کہیں نظر نہیں آیا۔ البتہ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے جو کچھ فرمایا وہ اُن کے مجموعۂ تقاریر میں موجود ہے۔ وہ انگریزی زبان میں تھا۔ جس کا ترجمہ یوں ہے:۔

> آپ میرے اور لاکھوں مسلمانوں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں؛ جب کہتے ہیں کہ پاکستان کو اُس "سوشل جسٹس" اور "اسلامک سوشلزم" کی محکم بنیادوں پر استوار ہونا چاہیئے جو انسانی اخوّت اور مساوات پر زور دیتی ہے۔

اس سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ 'اسلامک سوشلزم' کے الفاظ قائدِ اعظمؒ کے نہیں تھے۔ یہ اس ایڈریس میں تھے جسے ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ کا "جرم" اتنا ہی ہے کہ انہوں ایڈریس کے ان الفاظ کو دہرا دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے ان الفاظ کو "سوشل جسٹس" کے مترادف قرار دے کر دیں وضاحت کر دی کہ اس سے ان کی مراد انسانی اخوّت اور مساوات تھی۔ یہ ہے وہ واقعہ جسے اچھالتے ہوئے ہمارے سوشلسٹ حضرات قائدِ اعظمؒ کو اسلامک سوشلزم کا حامی قرار دیتے ہیں۔ اور اس باب میں سب سے محکم، مستند اور ناقابلِ تردید شہادت یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کے دستورِ پاکستان کے ابتدائیہ میں ایک شق یہ ہے کہ:۔

> ہم 'بانی پاکستان' قائدِ اعظمؒ محمد علی جناحؒ کے اس ارشادِ گرامی کے وفا شعار رہتے ہوئے کہ پاکستان ایک ایسی جمہوری مملکت ہو گی جو "سوشل جسٹس" کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہو گی۔
>
> اس آئین کو قوم کو دیتے، اور اس کے پابند رہنے کا عہد کرتے ہیں۔
>
> (انگریزی ایڈیشن ص۱)

ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد "اسلامک سوشل جسٹس" کے بجائے "اسلامک سوشلزم" کے نظریہ کو قائدِ اعظمؒ کی طرف منسوب کرنا، خود آئینِ پاکستان کی خلاف ورزی ہے۔ قوم کو یہ آئین دینے والوں

نے اپنے آپ کو قائدِ اعظمؒ کے "اسلامک سوشل جسٹس" کے نظریہ کے پابند رہنے کا اعلان کیا تھا، نہ کہ سوشلزم یا اسلامک سوشلزم کا!

اسلامک سوشلزم کی اصطلاح حال ہی کی وضع کردہ ہے اور اس کی ضرورت واضح ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ـــــ جز بقرآن ضیغمی روباہی است ـــــ یعنی قرآن کو ساتھ نہ رکھا جائے تو جو بظاہر شیر کی دھاڑ سنائی دیتی ہے، وہ درحقیقت لومڑی کا فریب ہوتا ہے۔ سوشلزم کے ساتھ "اسلامک" کا لیبل بھی روباہی ہے۔ روس اور چین میں کھلی ہوئی ڈکٹیٹرشپ ہے۔ اس لئے انہیں اپنے سوشلسٹ عقائد کو بے نقاب الفاظ میں پیش کرنے میں کوئی باک نہیں۔ لیکن یہاں ابھی جمہوری نظام رائج ہے۔ اس نظام کی بدترین لعنت یہ ہے کہ اس میں انتخابات اور ان میں ووٹ حاصل کرنے کا ہَوّا ہر وقت اعصاب پر سوار رہتا ہے، اس لئے کسی بات کے زبان پر لانے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ووٹ دینے والوں کے منشا یا عقائد کے خلاف نہ ہو۔ یہاں ووٹ دینے والوں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے، جن کے دل میں مذہب کی گہری عقیدت اور احترام ہے۔ اس لئے یہاں منشور میں تو سوشلزم کے برہنہ الفاظ رکھے جا سکتے ہیں، عوام میں کھلے بندوں یہ لفظ زبان پر لانا خلافِ مصلحت سمجھا جاتا ہے؛ اس لئے اسے کبھی "اسلامی سوشلزم" کبھی "مساواتِ محمدیہ" سے تعبیر کیا جاتا اور عندالضرورت آیاتِ قرآنی کے مقدس غلافوں میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے، اور یہ کبھی نہیں بتایا جاتا کہ، سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں فرق کیا ہے۔ اِسے ان میں سے کسی نے آج تک واضح نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں ان کی طرف سے کہا جاتا ہے تو اتنا ہی کہ سوشلزم، مذہب کے خلاف نہیں۔ کیا آپ لوگ دیکھتے نہیں کہ روس نے ترکستان وغیرہ کے مسلمانوں کو کس طرح مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ وہاں لوگ مسجدوں میں نمازیں پڑھتے ہیں اور خانقاہوں پر دیئے جلاتے ہیں۔

اِسلامی سوشلزم کیوں؟

اور یہیں سے میں پھر اپنے اُسی نکتہ کی طرف آ رہا ہوں، جہاں سے بات چلی تھی کہ سیکولر نظام میں مذہبی آزادی سے مفہوم چند عقائد، رسوم، یا نماز روزہ کی آزادی ہوتی ہے۔ جہاں تک زندگی کے معاملات کا تعلق ہے اقدارِ خداوندی کو ان سے یکسر خارج کر دیا جاتا ہے، خواہ ان کا تعلق امورِ مملکت سے ہو، خواہ مذہبی دنیا سے۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے یہ نظام اِسلام کی ضد ہے، اور یکسر طاغوتی، جس میں مذہبی آزادی، روباہی فریب سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ ہے وہ سیکولرازم، جس کا اب پاکستان میں بھی عام چرچا کیا جا رہا ہے۔ اور جس کی وجہ سے یہاں اخلاقی بے باکیاں عام ہو رہی ہیں۔ جمہوری سیکولرازم میں بھی اخلاقی اقدار کو امورِ مملکت سے الگ رکھا جاتا ہے۔ لیکن وہاں کم از کم اتنا لحاظ ضرور رکھا جاتا ہے کہ ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جاتا لیکن سوشلزم میں ان کی اس قدر پاسداری بھی نہیں کی جاتی۔ اس میں ان کے وجود ہی سے انکار کیا جاتا اور مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ سوشلزم کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے۔ اس کے ماوراء کچھ نہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ دنیائے انسانیت میں مختلف

ادوار میں مختلف نظریاتِ زندگی وضع اور عام ہوئے۔ لیکن، میں سمجھتا ہوں کہ، جو نظریہ سوشلزم نے پیش کیا ہے، انسان کے لئے اس جیسا ذلیل کن نظریہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ نظریہ انسان کو حیوانی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اس میں شرف و احترام آدمیت کا تصور تک باقی نہیں رہتا۔ جب آپ یہ تسلیم کر لیں کہ انسانی زندگی کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے، تو پھر انسان اور حیوان میں فرق کیا رہ جاتا ہے۔ حیوانات میں بھی تو سارا مسئلہ روٹی (یعنی بھوک) ہی کا ہوتا ہے ـــــ اس ذلت آمیز نظریہ کو پیش کرنے کے بعد، یہ حضرات ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تاریخ میں جن تصادمات کو حق و باطل کی کش مکش سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ بھی درحقیقت روٹی ہی کے جھگڑے تھے۔ روٹی سے بلند یا الگ تاریخ کی کوئی تعبیر صحیح نہیں۔ چنانچہ انگلز اس باب میں لکھتا ہے:۔

تاریخ کی مادی تعبیر

تاریخ کے مادی تصور کی ابتداء اس اصول سے ہوتی ہے کہ پیداوار، اور پیداوار کے ساتھ اس کی تقسیم ہی سوسائٹی کے ہر نظام کی بنیاد ہوتی ہے..... اس تصور کی رو سے، ہر تمدنی تغیر یا سیاسی انقلاب کی علت العلل، اس کے بنیادی اور اصلی سبب کو، لوگوں کے دلوں کے اندر، یا خارجی حق و صداقت اور عدل و انصاف کے متعلق ان کی وسیع بصیرت میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے دیکھنا چاہیئے کہ ان لوگوں نے پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقوں میں کیا تبدیلیاں کی تھیں۔ بالفاظِ دیگر ان تصادمات اور انقلابات کے بنیادی سبب کو ان کے فلسفۂ زندگی (نظریۂ حیات) میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اُس دور کی اقتصادیات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ (ANTIDUHRING. P.300)

جہاں تک آئیڈیالوجی یا نظریۂ حیات کا تعلق ہے، انگلز لکھتا ہے:۔

(اس میں شبہ نہیں کہ) آئیڈیالوجی کو نام نہاد مفکر شعوری طور پر عمل میں لاتا ہے لیکن اس کا یہ شعور جھوٹا (FALSE CONSCIOUSNESS) ہوتا ہے۔ اس کے عمل کے حقیقی محرکات، اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا عمل مبنی بر نظریہ کہلا نہ سکے۔ لہٰذا وہ جھوٹے یا سطحی محرکات کو حقیقی محرکات تصور کر لیتا ہے۔

(MARX_ ANGELS CORRESPONDENCE P.510-511)

یعنی جنہیں ہم حق و باطل کی کش مکش یا کفر و اسلام کے تصادمات کہتے ہیں، وہ درحقیقت حق و باطل کی کش مکش نہیں، بلکہ معاشی لڑائیاں تھیں ـــــ مصلحین، حتیٰ کہ انبیاء کرامؑ (معاذ اللہ) خود فریبی میں مبتلا ہوتے تھے جو انہیں حق و باطل کا تصادم سمجھ لیتے تھے۔ ان کا حقیقی جذبۂ محرکہ معاشی ہی

ہوتا تھا جو شعوری طور پر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا۔ جس چیز کو وہ وحی یا خارجی علم سمجھ لیتے تھے، وہ دراصل ان کا چھوٹا شعور ہوتا تھا — بالفاظِ دیگر اس نظریہ کی رو سے کشمکش صاحب مذہب کلیم (حضرت موسےٰؑ) اور فرعون — یا تصادم حضرت ابراہیمؑ اور نمرود۔ حتیٰ کہ آویزش بوالہب و محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے حقیقی محرکات معاشی تھے۔ لیکن یہ حضرات (معاذ اللہ) خود فریبی کی وجہ سے انہیں مبنی بر وحی، تصادماتِ حق و باطل سمجھ لیتے تھے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ سوشلزم جسے یہاں عام کیا جا رہا ہے۔ چونکہ ان کے نزدیک، مسئلہ سارا روٹی کا ہے، اس لئے اس نظریہ کے عام کرنے کی ٹکنیک یہ ہوتی ہے کہ ملک میں بھوک اور افلاس، اشیائے ضروریہ کی گرانی اور نایابی اس قدر عام کر دی جائے کہ لوگ بلبلا اٹھیں اور جب روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کیا جائے تو وہ اس کی طرف لپک کر آ جائیں۔ ان کی یہی وہ ٹکنیک ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، محمد حنیف رامے صاحب نے، ۵ ستمبر کو (یعنی وزارت سے الگ ہو جانے کے بعد) اپنی ملتان کی تقریر میں کہا:-

> مَیں نے اپنی بجٹ تقریر میں سوشلزم کا نام لیا۔ میرے بہی خواہوں نے کہا، تم نے غضب کیا۔ تم تو مرکزی وزیرِ خزانہ بننے والے تھے۔ نوائے وقت نے لکھا کہ اسلامی ممالک ناراض ہو جائیں گے۔ سعودی عرب امداد بند کر دے گا۔ مَیں نے کہا اچھا ہے، بیرونی امداد بند ہو گی۔ بھوک بڑھے گی تو انقلاب آئیگا۔
>
> (نوائے وقت۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۵ء)

یعنی لوگوں کو اس قدر بھوکا مارا جائے کہ وہ اخلاق، اقدار، نظریہ، آئیڈیالوجی، ایمان، ایقان سب بھول جائیں اور انہیں فقط روٹی یاد رہ جائے۔ سعدی نے مدت ہوئی کہا تھا کہ ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

اُس زمانے میں تو بھوک کا مارا، عشق ہی بھولتا تھا، اب سوشلزم کے دور میں وہ خدا — رسولؐ — وحی — ایمان — سب کچھ بھول کر فقط روٹی یاد رکھتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جس تک اِس بدنصیب قوم کو پہنچایا جا رہا ہے۔

پاکستان میں سوشلزم کے داعیوں کی مخالفت میں جو حضرات میدان میں اترے ہیں — یاد رہے کہ ان حضرات کی باہمی مخالفت یا مجادلت، جنگِ زرگری سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی، جس کے محرکات سیاسی تقاضے ہوتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ ہم یہاں سوشلزم کبھی نہیں آنے دیں گے۔ ہم اسلامی نظامِ معیشت قائم کریں گے۔ ان سے کہا گیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو آپ اسے سیدھی طرح، اسلامی معیشت کیوں نہیں کہتے؟..... ارشاد ہوا کہ ہم ایسا کہہ تو دیتے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ؎

ملک میں اسلام کی دعویدار بے شمار سیاسی جماعتیں موجود ہیں۔ ایسی جماعتوں

لئے سرمایہ داری اور جاگیرداری کو اسلام قرار دے دیا۔ جس سے اُلجھن پیدا ہوئی۔ اس الجھن کی وجہ سے ہم اسلامی سوشلزم اس لئے کہتے ہیں کہ ہم، اسلام کی دعویدار دوسری جماعتوں سے اپنے سیاسی اور معاشی پروگرام کو ممیز کر سکیں۔ (مولانا کوثر نیازی۔ بحوالہ نوائے وقت ۲۲ ستمبر ۱۹۷۵ء)

ان کی اس دلیل کو ذرا آگے بڑھایئے۔ ان کی پارٹی کے منشور میں ہے کہ "اسلام ہمارا مذہب" ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہاں ہر فرقہ کا اسلام کا تصور الگ الگ ہے۔ تو ان حضرات کو چاہیئے کہ اپنے اسلام کو دوسرے فرقوں اور پارٹیوں کے اسلام سے ممیز کرنے کے لئے اس کا بھی کوئی الگ نام رکھیں۔ اس کے لئے "سیکولر اسلام" شاید موزوں نام ہو۔ اگر اسلام اور سوشلزم جیسے متضاد تصورات یک جا ہو سکتے ہیں تو اسلام اور سیکولرازم کیوں اکٹھے نہیں ہو سکتے! بالخصوص اس لئے کہ ان کی طرف سے اس قسم کے اعلانات تو پہلے ہی ہو چکے ہیں کہ "ہمارا دستور سیکولر ہے۔ کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ ملک کے تمام شہری یکساں سلوک کے حقدار ہیں" (مسٹر بھٹو۔ بحوالہ ایشیا ۲۲ ستمبر ۱۹۷۴ء۔ طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۴ء) اور پھر ان کے منشور میں اسلامی سوشلزم نہیں، صرف سوشلزم درج ہے۔ بہرحال یہ ہے وہ مذاق جو یہاں قوم ہی سے نہیں، خود دین سے ہو رہا ہے، اور منتہیٰ اس کا سیکولر نظام کا قیام ہے۔

ان حالات میں عزیزانِ من! آپ خود سوچ لیجئے کہ اس ملک کا حشر کیا ہونے والا ہے — سوشلزم کی رو سے (خواہ اس کا نام خالی سوشلزم ہو یا اسلامی سوشلزم) یہاں جس قسم کا نظام قائم ہوگا وہ سیکولرازم کی شدید شکل ہوگی جس میں مستقل اقدار خداوندی کا نام تک لینا جرم قرار پا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے سیکولرازم پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جب دین اور سیاست الگ الگ ہو جائیں تو سیاست، چنگیزیت بن جاتی ہے اور دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اقدار نہ اس میں باقی رہتی ہے، نہ اس میں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب اور سیکولر نظام میں سمجھوتا ہو جاتا ہے، جس طرح ملوکیت اور مذہب میں سمجھوتا ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ جو آپ اربابِ مذہب کی طرف سے سوشلزم کی مخالفت میں آوازیں اٹھتی دیکھ رہے ہیں، تو یہ درحقیقت اس باہمی مفاہمت کی شرائط طے کرنے کے ہونکارے ہیں۔ اور سوشلزم کے ساتھ جو "اسلامی" کا لیبل لگایا جا رہا ہے، تو یہ اسی گفتگوئے مصالحت پر آمادگی کا اشارہ ہے۔ فرعونیت اور ہامانیت کا گٹھ جوڑ تاریخ کی زندہ حقیقت ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ یہاں اقامتِ دین کے مدعیوں نے کس طرح اس نظام سے سمجھوتہ کر رکھا ہے، جسے وہ بھارت کے کافرانہ نظام سے بھی بدتر قرار دیا کرتے تھے۔

سیکولرازم کی تباہ کاریاں

ہم نے دیکھ لیا کہ سیکولر نظام ہیں، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے، مستقل اقدارِ خداوندی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ یہ تو ضروری نہیں کہ اس نظام ہیں، معاشی خوشحالیاں حاصل ہو جائیں۔ ہمارے سامنے ایسے ممالک بھی ہیں جو سیکولر نظام کے باوجود معاشی بدحالیوں کے شکنجہ میں جکڑے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس میں معاشی کشاد بالضرور حاصل ہو جاتی ہے تو سوال یہ ہے کہ جو معاشی خوشحالیاں اخلاقی اقدار سے اغراض برت کر حاصل کی جائیں، وہ پائیدار بھی ہو سکتی ہیں۔ اس کا جواب بھی مغربی مفکرین کی زبان سے سنیئے۔ برلیفو، جس کا ذکر متعدد بار ہو چکا ہے لکھتا ہے:۔

> انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبّر اور دانش مندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جبتک اسکی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے..... قوت، تہذیب، کلچر بے معنی چیزیں ہیں۔ اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ، جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت ماپی جا سکتی ہے، اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔
> (تشکیلِ انسانیت۔ انگریزی۔ صفحہ ۱۵۹، ۲۵۹)

دوسرے مقام پر برلیفو لکھتا ہے:۔

> وہ نظامِ تہذیب، جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو، آخرالامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے، وہ اجتماعی نظام، جس کا وہ جزو ہے، اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار برباد ہو جاتی ہے۔ انتخابِ طبیعی کے اٹل قانون کی بنا پر گناہ کی اُجرت موت ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۶۲)

قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر رزق کی فراوانیوں کو مستقل اقدار کے تابع نہ رکھا جائے تو وہی فراوانیاں معاشرہ کی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔ سورۃ قصص میں ہے۔ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا۔ (۲۸/۵۸) "کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنہیں رزق کی فراوانیاں حاصل تھیں لیکن اس کے باوجود وہ تباہ ہو گئیں۔ یہ ہیں ان کے اجڑے ہوئے کاشانے، جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے" بلکہ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس طرح چراغ سحری بجھنے سے پہلے

اور تیزی سے جگمگاتا ہے، اسی طرح جب کسی قوم کے ہلاکت کے دن قریب آجاتے ہیں تو ان کے ہاں دولت سیلاب کی طرح امڈ کر آجاتی ہے۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ۔ (۶/۴۴) "ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم ان اقدار کو فراموش کر دیتی ہے، جن کی انہیں اکثر یاددلائی کرائی جاتی رہی ہے تو ان پر سامانِ زیست کے پھاٹک کھل جاتے ہیں اور جب وہ دولت کے نشہ میں مدہوش ہو جاتے ہیں تو ان پر اچانک تباہی آجاتی ہے۔ ایسی تباہی جس میں امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی"

مذہب پرست قومیں

آپ نے دیکھا کہ اس وقت ساری دنیا میں تباہی اور بربادی کا جو طوفان برپا ہے اس کے متعلق خود اقوامِ مغرب کے مفکرین بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کی بنیادی وجہ اخلاقی اقدار کا فراموش کر دینا ہے۔ یہ اقدار وحی کی رُو سے مل سکتی ہیں اور وحی آج اپنی حقیقی اور منزہ شکل میں صرف قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ لہٰذا دنیا کی نجات کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ وہ اس نظام کو قائم کریں جو قرآنی اصول و اقدار پر استوار ہو۔ لیکن یہاں ایک اور دشواری سامنے آتی ہے، جسے میں سمجھتا ہوں کہ بلے باکانہ سامنے لے آنا چاہیئے۔ قرآن کریم اس کی شہادت دیتا، اور تاریخ اس کی تائید کرتی ہے کہ دینِ خداوندی کی طرف وہ قومیں بمشکل آیا کرتی ہیں جن پر مذہب کی گرفت ہو۔ یہ اس لئے کہ مذہب ان لوگوں کا ذریعۂ معاش ہوتا ہے جنہیں روٹی کمانے کا کوئی ہنر نہیں آتا۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے ظہور کے وقت یہودی سب سے زیادہ مذہب زدہ قوم تھی۔ اور انہی کی طرف سے ان کی دعوتِ انقلاب کی سب سے زیادہ شدید مخالفت ہوئی ——— اس مخالفت کی حقیقی وجہ کیا تھی، اس کی پردہ کشائی انجیل برنباس میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:-

> تب اُن لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ شخص (یعنی حضرت عیسےٰ) بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی۔۔۔ اس جیسے آدمی کی حکومت میں ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم خدمت سے نکال دیئے جائیں گے، اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ (صفحہ ۱۴۲)

یہ لوگ حکومتِ روما کے سیکولر نظام سے بہت خوش تھے اور اسی کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور دعوتِ عیسوی اس نظام کو ختم کر کے حکومت اور مذہب دونوں کو اقدارِ خداوندی کے تابع لانا چاہتی تھی۔ اسی خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا:-

> اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور اس میں مداخلت نہیں کرتے۔ جیسے ہم ان کی شریعت میں مداخلت

نہیں کرتے۔ لہٰذا ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں کہ ہم اپنے اہل جو جی چاہے کر لیں۔ اگر ہم غلطی کرتے ہیں تو ہمارا اللہ رحیم ہے۔ قربانیوں اور وعدوں کے ذریعہ اسے راضی کر لینا ممکن ہے، مگر جب یہ شخص بادشاہ ہو گیا، تو ہرگز راضی نہ کیا جا سکے گا۔ جب تک وہ اللہ کی اطاعت ویسے ہی نہ ہوتی دیکھ جیسی موسےٰؑ نے لکھی ہے۔ (ایضاً)

دعوتِ عیسوی کے بعد جب دعوتِ محمدیہ کا ظہور ہوا تو اہلِ کتاب کی طرف سے اس کی جس شدت سے مخالفت ہوئی۔ اس کی تفصیل سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ اس مخالفت کی حد یہ تھی کہ قریش جیسے کھلے ہوئے دشمنوں تک نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن ان (اہلِ کتاب) کی سازشیں جاری رہیں۔ حتیٰ کہ انہیں ملک سے باہر نکال دینا پڑا۔ اسی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ قرآنی اقدار کے قبول اور اختیار کرنے کا امکان ان قوموں میں زیادہ ہے جو مذہب کی توہم پرستیوں سے اپنا دامن چھڑا چکی ہیں۔

اِس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں جس میں بعض احباب مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ کہہ دیتے ہیں کہ جب قرآنی نظام کا قیام اُن قوموں میں مستبعد ہے جن میں مذہب کی گرفت بڑی شدید ہے تو مسلمانوں کی (اور سب سے پہلے ہم پاکستانی مسلمانوں کی بھی یہی کیفیت ہے، تو پھر یہاں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت سے کیا حاصل ہو گا؟ اس کے جواب میں، میں اس نکتہ کو دہرا دینا کافی سمجھتا ہوں جسے میں نے اس سے پہلے بھی متعدد بار پیش کیا ہے۔ سورۃ الرعد کی

یہاں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت سے کیا حاصل ہو گا؟

ایک آیت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ایک مقام پر حضورؐ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ معصوم سی آرزو اُبھری کہ مالک الملک! جس مقصد کے حصول کے لئے میں ایک عمر سے اس قدر مصروفِ تگ و تاز ہوں، کیا میں اسے اپنے سامنے حاصل ہوتا دیکھ سکوں گا؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں تھے، لیکن خدا تو عالم الغیب تھا۔ اُسے اس کا علم تھا کہ ایسا ہو کر رہے گا اور قرآنی نظام کا قیام حضورؐ کی زندگی میں عمل میں آ جائے گا۔ بنا بریں اللہ تعالےٰ آپ کو حتمی الفاظ میں بتا سکتا تھا کہ آپ مطمئن رہیئے ایسا ہو جائے گا۔ لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس لئے کہ اس سے ہمیں ایک بڑا عمیق نکتہ سمجھانا مقصود تھا۔ حضورؐ کو جواب یہ دیا گیا۔ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۔ (۱۳/۴۰) یعنی اللہ تعالےٰ نے آپؐ سے کہا کہ آپؐ کو اس کا خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ مقصد آپ کی زندگی میں حاصل ہو جائے گا یا نہیں۔ آپؐ کا فریضہ اتنا ہی ہے کہ آپ اس پیغام کو دوسروں تک پہنچاتے جائیے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانون کے حساب سے یہ کب واقع ہو گا۔

آپ بس اپنا یہ فریضہ ادا کرتے جائیے۔ اس سے درحقیقت ہمیں یہ سمجھنا مقصود ہے کہ خدا نے ہمارے ذمے یہ فریضہ عائد نہیں کیا کہ ہم (کم از کم پاکستان میں) قرآنی نظام قائم کر کے رہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ تم خود ہی یہ فرض کر لیتے ہو کہ یہ تمہاری ذمہ داری ہے اور جب یہ پوری ہوتی نظر نہیں آتی تو مایوس ہو کر یہ کہتے ہوئے بیٹھ جاتے ہو کہ جب ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تو اس تگ و تاز سے فائدہ کیا؟ تمہاری اس مایوسی اور شکست خوردگی کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اس بات کو اپنے اوپر فرض قرار دے لیا جو تمہارا فریضہ نہیں تھی۔ اور جب یہ فریضہ تمہاری آرزو اور پروگرام کے مطابق پورا ہوتا نظر نہ آیا تو تم ہمت ہار کر بیٹھ گئے، اور اپنے آپ کو یہ فریب دے لیا کہ اس سعیٔ لاحاصل سے کیا فائدہ ہے؟ یہ تمہارا فریضہ ہی نہیں تھا۔ تمہارا فریضہ اس پیغام کو عام کرتے چلے جانا ہے۔ تم اس فریضہ کو ادا کرتے جاؤ۔ اور زندگی کے آخری سانس تک ادا کرتے رہو۔ ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ تم نے اپنی زندگی میں قرآنی معاشرہ قائم کر کے کیوں نہیں دکھایا۔ ہم تم سے اتنا ہی پوچھیں گے کہ تم نے فریضۂ تبلیغ ادا کیا تھا یا نہیں! اور اس فریضہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہم سے کہا گیا کہ قرآنی معاشرہ کے قائم نہ ہونے سے اگر پوری کی پوری قوم بھی تباہ ہو جائے گی تو اس کی ذمہ داری تم پر عائد نہیں ہوگی، لیکن اگر کوئی فرد بھی اس لئے تباہ ہو گیا کہ تم اس تک یہ پیغام پہنچا سکتے تھے، لیکن تم نے ایسا نہ کیا، تو اس کی باز پرس تم سے ضرور کی جائے گی۔ لہٰذا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰) تم قرآن کے ذریعہ لوگوں کو اس کی یاد دہانی کراتے رہو تاکہ کوئی ایک فرد بھی اس لئے تباہ نہ ہو جائے کہ اس تک بات نہیں پہنچی تھی۔ آپ نے دیکھا، عزیزانِ من! کہ قرآنِ کریم نے ہم سے کیسی عظیم بات کہہ دی ہے۔ قرآن کی عائد کردہ ذمہ داری میں، مایوس ہونے کا کوئی مقام ہی نہیں آتا۔ مایوسی تو اُسے ہوتی ہے جسے اپنا مقصد پورا ہوتے نظر نہ آتا ہو۔ جس کا مقصد ہی قرآنی نظریۂ حیات کو دوسروں تک پہنچانا ہو، اُسے مایوسی کس طرح ہو سکتی ہے؟ اقبالؒ نے اسی لئے کہا ہے کہ ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازداروں میں

'نومیدی' اسی لئے زوالِ علم و عرفاں، بلکہ کفر ہے، کہ ہم خود اپنے دل سے ایک مقصد وضع کرتے ہیں اور جب وہ حاصل نہیں ہوتا تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تقاضائے علم و عرفاں یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ خدا نے ہم پر کیا فریضہ عائد کیا ہے۔ خدا کبھی ایسا فریضہ عائد نہیں کرتا جس کا پورا کیا جانا، ناممکن ہو۔ اور اس کی وجہ سے ہم مایوس ہو کر بیٹھ جائیں۔ لہٰذا میرے عزیز قرآنی رفیقو! ہم کبھی مایوس ہو ہی نہیں سکتے، ہمارا فریضہ اس فکر کو عام کرتے چلے جانا ہے، اس ارشادِ خداوندی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) اور اس یقین کے ساتھ کہ اس مقصد کو بہرحال پورا ہو کر رہنا ہے، خواہ ہمارے سامنے ہو یا اس

کے بعد خواہ اس سرزمین ہو اور خواہ کسی دوسرے خطۂ زمین میں۔ یہ یقین بھی ہمیں کبھی مایوس نہیں ہونے دے گا۔

ہے افق سے ایک سنگِ آفتاب آنے کی دیر ٹوٹ کر مانند آئینہ بکھر جائے گی رات

قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا مقصود و منتہا یہ ہے کہ اسلام جو مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے، اس کی نمود پھر سے دین کی صورت میں ہو جائے۔ بالفاظِ دیگر ایک ایسا نظام یا

حَسْبُنَا کِتَابُ اللہ

مملکت قائم ہو جائے جس کا سارا کاروبار قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ اس کے ہر فیصلہ کی سند اور حجت خدا کی یہ کتابِ عظیم ہو۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطباتِ تشکیلِ جدید میں کہا ہے کہ ایسا انہی کے ہاتھوں ممکن ہوگا کہ جو عمرؓ کی سی روحِ حریت لے کر اٹھے، جس نے خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ ارضی میں یہ کہنے کی جرأت کی تھی کہ

حَسْبُنَا کِتَابُ اللہِ

میری زندگی کا مشن، عزیزانِ من! اسی نعرۂ حریت کو عام کرنا ہے۔ واضح رہے کہ یہ نعرہ خود خدا کا عطا فرمودہ ہے، جس نے کہا ہے کہ اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۲۹/۵۱) "اے رسولؐ! کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف وہ کتاب نازل کی ہے، جسے ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ کتاب جس میں اس پر ایمان لانے والوں کے لئے سامانِ رحمت اور اسبابِ شرف و موعظت ہے۔" باقی رہا یہ الزام کہ ایسا کہنے سے انکارِ رسالت لازم آتا ہے، تو اس کے جواب میں، میں اس وقت اتنا ہی کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اگر اس اعلان پر حضرت عمرؓ منکرِ شانِ رسالت قرار نہیں پاتے، تو کوئی اور کس طرح منکرِ شانِ رسالت قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں البتہ اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے "حَسْبُنَا کِتَابُ اللہ" کہنے اور فرقۂ اہلِ قرآن کے ایسا کہنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں دین کے اس بنیادی تصور کی نشر و اشاعت تو اپنا فریضہ سمجھتا ہوں، لیکن قرآن کریم کی روشنی میں امت کے لئے عملی پروگرام مرتب اور متعین کرنے کا حق، اسلامی مملکت کے لئے مخصوص سمجھتا ہوں۔ کسی فرد یا گروہ کو اس کا مجاز نہیں سمجھتا۔ اس فرق کی وضاحت میں نے ایک مبسوط مقالہ میں کی ہے جو طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۵۵ء میں — فرقۂ اہلِ قرآن کی پھیلائی گمراہیاں کے عنوان سے شائع ہوا ہے اور جس کا پمفلٹ بھی چھپ گیا ہے۔

اب میرا روئے سخن بالخصوص کاروانِ قرآن کے اپنے ہم سفر رفقاء کی طرف ہے۔ آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ آپ کس قدر عظیم فریضہ کو لے کر اٹھے ہیں۔ آپ قابلِ صد مبارکباد ہیں کہ آپ، کسی

ستائش کی تمنا اور صلہ کی امید کے بغیر، اور اس کے برعکس، ہر قسم کے طعن و تشنیع اور جھوٹے الزامات کے تیر و نشتر کے ہدف بننے کے باوجود، گذشتہ بیس پچیس سال سے اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنی بساط کے مطابق سرگرم عمل ہیں۔ اس سلسلہ میں میں اس تنبیہہ کو دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں، جو اس سے پہلے بھی متعدد بار آپ کے گوش گزار کر چکا ہوں۔ اور وہ یہ کہ آپ کے قول اور عمل سے کوئی بات ایسی نہ سرزد ہونے پائے جو اُمت میں تفرقہ کا موجب ہو۔ تفرقہ انگیزی قرآن کریم کی نصِ صریح کے مطابق شرک ہے۔

ایک ضروری تنبیہہ

اور یہ شرک بھی کیسا مہیب ہے، اس کے لئے حضرتِ ہارون علیہ السلام کا وہ واقعہ سامنے لائیے جسے قرآن کریم نے ہماری تنذیر کے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔ جب حضرتِ موسیٰؑ چند دنوں کے لئے قوم سے الگ ہوئے تو انہیں حضرتِ ہارونؑ کی نگرانی میں دے دیا۔ واپسی پر دیکھا کہ قوم بچھڑے کی پرستش کر رہی ہے۔ انہوں نے سخت برافروختہ ہو کر حضرتِ ہارونؑ سے کہا کہ آپ نے اپنی آنکھوں کے سامنے یہ کچھ ہوتے دیکھا اور انہیں اس مشرکانہ فعل سے روکا نہیں۔ اس کے جواب میں حضرتِ ہارونؑ نے جو کچھ فرمایا وہ ہمارے لئے آیۂ عبرت ہے۔ آپ نے کہا کہ میں نے یہ کچھ اس لئے ہونے دیا کہ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔ (۲۰/۹۴) "میں ڈرتا تھا کہ تم آکر یہ نہ کہو کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا"۔ اس جواب سے حضرتِ موسیٰؑ بھی مطمئن ہو گئے۔ آپ غور کیجئے کہ یہ کہنے والے بھی خدا کے ایک رسول تھے اور اس کے جواب سے مطمئن ہو جانے والے بھی خدا کے رسول — اس سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ تفرقہ انگیزی کس قدر سنگین جرم ہے۔ بنی اسرائیل کا وقتی سا شرک ان کی جہالت کا نتیجہ تھا جو انہیں سمجھانے پر رفع ہو سکتا تھا۔ (چنانچہ وہ اُسی وقت رفع ہو گیا) لیکن تفرقہ ایسا جرمِ عظیم تھا جس کے نتائج نسلوں تک متعدی چلے جاتے۔ یہ وجہ ہے جو میں شروع سے یہ تاکید کرتا چلا آ رہا ہوں کہ آپ اس فکر کو عام کیجئے، لیکن کوئی فرقہ یا پارٹی یا جداگانہ جماعت بنائے بغیر۔ آپ کی بزموں کی حیثیت بھی ایک تنظیمی کوشش سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ آپ جس قرآنی فکر کو عام کرتے ہیں، اس کی تردید میں کسی کو ایک لفظ بھی زبان پر لانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اس لئے کہ وہ مبنی بر سند و حجت ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے اس مخالفت کے لئے جو یہ اختیار کیا ہے کہ مشہور کر دیا جائے کہ یہ ایک جداگانہ فرقہ ہے، جس کا مسلک نہ نمازیں، نہ روزے وغیرہ وغیرہ ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ جھوٹ اب اپنی موت آپ مر رہا ہے اور میرے اُس مقالہ نے جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے اس باب میں بڑا مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ میں اس باب میں اس قدر محتاط ہوں کہ اکثر احباب کے تقاضوں کے باوجود میں اس پر بھی رضامند نہیں ہوتا کہ کنونشن کے دوران ہم یہیں نماز ادا کر لیا کریں۔ میری تاکید یہی ہے کہ نمازیں قرب و جوار کی مسجدوں میں جا کر ادا کی جائیں۔ یاد رکھئے کہ نماز کی علیحدہ ادائیگی الگ فرقہ کی وہ نشانی ہے جو اُن کے ماتھے پر

ملتی ہوتی ہے۔ ہم اس جرم کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے۔ ہم اُمت سے الگ کوئی مسلک نہیں اختیار کرنا چاہتے۔

بعض احباب نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ طلوعِ اسلام والوں سے جب کہا جاتا ہے کہ وہ نماز کیوں نہیں پڑھتے تو وہ اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ نماز میں رکھا ہی کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ "طلوعِ اسلام والوں" سے ان کا مطلب کیا ہوتا ہے، اور وہ کون ہیں جو ایسا کہتے ہیں — لیکن، بایں ہمہ، میں آپ احباب سے عمومی حیثیت سے یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی صاحب نماز، روزہ وغیرہ کے پابند نہ ہوں تو انہیں اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ اس قسم کا غلط جواب نہیں دینا چاہیئے۔

انفرادی احکام

اسی سلسلہ میں ایک اور ضروری بات بھی آپ احباب کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔ قرآنِ کریم میں متعدد احکام اور ہدایات ایسے ہیں جنہیں ہم انفرادی طور پر بجا لا سکتے ہیں اور ان کی بجاآوری ہماری سیرت اور کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ لیکن بعض احباب کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ ان پر عمل اس وقت ہو سکتا ہے جب اسلامی نظام قائم ہو۔ ایسا کہنا اگر فریب دہی نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے مہمات امور بھی ہیں جن کی سرانجام دہی اسلامی نظام ہی میں ممکن ہے۔ لیکن جن امور پر موجودہ حالات میں بھی انفرادی طور پر عمل ہو سکتا ہے ان پر عمل پیرا نہ ہونا ہمارے کردار کی خامی اور سیرت کی نا پختگی ہے۔ میں ان میں سے چند ایک قرآنی ہدایات کی نشان دہی کرتا ہوں۔ آپ انہیں دیکھئے اور سوچئے کہ ان پر بحالاتِ موجودہ عمل پیرا کیوں نہیں ہوا جا سکتا۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے۔ (۱) اپنے وعدوں کا ایفا کرو۔ (۲) معاہدوں کی پابندی کرو۔ (۳) بات غیر مبہم، صاف، واضح اور دو ٹوک کرو۔ (۴) ایسی باتیں کرو جو حُسن کا پہلو لئے ہوں۔ (۵) دوسروں کی عیب جوئی کے لئے ان کی ٹوہ میں نہ رہا کرو۔ (۶) لوگوں سے ترش روئی سے پیش نہ آؤ۔ (۷) ان کے بُرے بُرے نام نہ رکھو۔ (۸) غیبت نہ کرو۔ (۹) یونہی اکڑتے نہ پھرو۔ (۱۰) افواہوں پر یقین نہ کر لیا کرو۔ ان کی خود تحقیق کیا کرو۔ (۱۱) لغویات سے پرہیز کرو۔ (۱۲) راستہ چلتے ہوئے اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو، اور ہر قسم کی بے حیائی اور فحاشی سے بچو۔ (۱۳) بدظنی سے پرہیز کرو۔ (۱۴) یونہی غصہ میں مشتعل نہ ہو جایا کرو۔ (۱۵) جو لوگ تمہارے دین کا مذاق اڑائیں ان سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ (۱۶) بوڑھے والدین سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ (۱۷) گھر کی زندگی کو خوشگوار رکھو۔ (۱۸) جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں ان کی عزت اور دلجوئی کرو۔ (۱۹) اگر تم کسی محتاج کی حاجت روائی کرنے کے قابل نہ ہو تو اس سے کم از کم نرم خوئی کا برتاؤ کرو۔ (۲۰) غور و فکر کی عادت ڈالو۔

میں نے قرآنِ کریم کی اخلاقی ہدایات میں سے یہ چند ایک مثال کے طور پر پیش کی ہیں۔ آپ

فرمائیے کہ ان میں سے کونسی بات ہے جس پر بحالاتِ موجودہ انفرادی طور پر عمل نہیں کیا جا سکتا؟ آپ سے میری التماس ہے کہ آپ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی کردار کا بھی خیال رکھیں، اور حق تو یہ ہے کہ فکری پیش کش بھی اُسی کی مؤثر ہو سکتی ہے جس کا کردار قابلِ اعتماد ہو۔ جو بھرے مجمع میں کہہ سکے کہ میں نے تم میں اپنی عمر گذاری ہے۔ تم اس سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میرے عزیز رفیقو! زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو معمولی نہ سمجھو۔ کیریکٹر کی تو پہچان ہی روزمرہ کی زندگی میں اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے امور سے ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ میں نہ کسی جماعت کا امیر ہوں، نہ کسی فرقہ کا امام، نہ کسی سلسلۂ تصوّف کا مقتدا، جو آپ احباب سے حکماً کچھ کرا سکوں، یا آپ کا مواخذہ کر سکوں۔ میں تو آپ ہی میں سے ایک ہوں اور جو کچھ آپ سے کہتا ہوں وہ "تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کی ذیل میں آتا ہے۔ یعنی رفقائے کار کا ایک دوسرے کو حق اور استقامت کی تلقین کرتے رہنا۔ اس توصیہ کے بعد میں آپ سے گذارش کروں گا کہ آپ دنیا کے طعن و تشنیع اور جھوٹی الزام تراشیوں اور بہتان بازیوں کی پروا کئے بغیر، اپنی خود عائد کردہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سرگرمِ عمل رہیئے۔ کسی کا ایک بڑا خوبصورت مصرعہ ہے کہ —— خلقے پس دیوانہ و دیوانہ بکارے — دنیا دیوانے کے پیچھے، اُسے گالیاں دینے اور اینٹ پتھر مارنے لگی ہوئی ہے، اور دیوانہ اپنی دھن میں مست، جانبِ منزل، رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ اس قسم کی "دیوانگی" پر ہزار فرزانگی قربان کی جا سکتی ہے۔ اور یہ نعمتِ کبریٰ قرآن کریم کی بارگاہ ہی سے مل سکتی ہے۔

مژدۂ جانفزا

اور آخر میں عزیزانِ من! وہ مژدۂ جانفزا، جسے سُننے کے لئے آپ ہمہ تن گوش ہیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر کہ اربابِ ذوق، قرآنِ کریم پر خود غور و فکر کرنے کے قابل ہو سکیں، میں نے اپنی متعدد تصانیف کے بعد لغات القرآن لکھی جو اس ضمن میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔ لیکن اس سے رہروانِ دشتِ قرآنی کی تشنگی اور بڑھ گئی اور تقاضا ہوا کہ اس لغات کی روشنی میں پورے کے پورے قرآنِ کریم کا مسلسل مفہوم مرتب کیا جائے۔ وہ بھی بتوفیقِ ایزدی مرتب اور شائع ہو گیا تو تقاضا اور بڑھا۔ قرآنِ کریم کا اندازِ بیان یہ ہے کہ وہ کسی ایک موضوع پر بتمام و کمال ایک ہی جگہ بات نہیں کرتا، اسے مختلف مقامات پر متنوع پیرایوں میں پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی تعلیم کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ تمام مقامات بیک وقت سامنے آ جائیں۔ میں نے قرآنِ کریم کو اسی انداز سے سمجھا تھا، اور اس کی آیات کو اسی ترتیب سے مربوط کیا تھا۔ اسے اصطلاح میں "تبویب" یا (CODIFICATION) کہا جاتا ہے۔ اس کا ضخیم مسودہ مرتب ہو چکا تھا کہ پچھلے سال آپ احباب نے تقاضا کیا کہ اسے بھی شائع کیا جانا چاہیئے۔ آپ کی اس طلبِ صادق اور حوصلہ افزائی نے مجھے بھی اس پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ اس مسوّدہ کی کتابت

شروع کرا دی گئی۔ معلوم نہیں وہ کتنی جلدوں میں سما سکے۔ لیکن کافی غور و فکر کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ اس سے اسی صورت میں استفادہ کیا جا سکتا ہے جب اس کا انڈیکس سامنے ہو۔ اور ظاہر ہے کہ انڈیکس اسی وقت مرتب ہو سکتا ہے جب وہ تمام جلدیں شائع ہو جائیں۔ اس میں ظاہر ہے کہ وقت لگے گا۔ لیکن چونکہ اس کا مسودہ مرتب اور مکمل ہے، اس لئے اس کے طبع ہونے میں دقت تو لگ جائے گا۔ امید ہے کوئی رکاوٹ نہیں پیش آئے گی۔

میں نے اس کے بعد اطمینان کا سانس لیا کہ اس ضمن میں میں نے جو کچھ کرنا تھا وہ بحمد للہ کر چکا ہوں۔ اور اب میں (ملازمت پیشہ حضرات کی اصطلاح میں) ریٹائر ہو جاؤں گا۔ لیکن وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ؎

مکتبِ عشق کا انداز نرالا دیکھا　　اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

میری ریٹائرمنٹ تو کجا، چھٹی تک بھی منظور نہ کی گئی۔ میرے درس قرآن کا متواتر سلسلہ قریب بیس سال سے جاری ہے۔ ان میں شرکت کرنے والے، ارباب ذوق کا فیصلہ یہ ہے کہ ان درسوں سے قرآنِ کریم جس بلیغ اور حسین انداز سے سمجھ میں آ جاتا ہے اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ یہ درس ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے محفوظ کئے جاتے ہیں۔ کوئی دس سال

دروسِ قرآنی

اُدھر کا ذکر ہے کہ میرے ایک قدیمی رفیق ملک ظہور احمد صاحب نے از خود ان ٹیپس کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا شروع کر دیا، اور اس خارہ شگافی کو اس استقامت اور استقلال کے ساتھ جاری رکھا کہ تیشۂ فرہاد کے قصے اس کے سامنے داستانِ پارینہ اور افسانہ ہائے خواب بن کر رہ گئے۔ میں جب ان کی اس کوہکنی کو دیکھتا تو ان کے حق میں دعائیں بےساختہ میرے لبا پر آ جاتیں—— سالِ گذشتہ، جب میں نے تبویب القرآن کی تکمیل کا اعلان کیا تو احباب کی طرف سے بیک زبان تقاضے شروع ہو گئے کہ اب جو تم (بزعم خویش) ہر طرح سے فارغ ہو چکے ہو تو ان درسوں کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کر دو—— اس وقت میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ جسے میں فرہاد کی خارہ شگافی سمجھتا تھا، وہ درحقیقت، پہ قرین کی در بندی کے لئے پتھر تراشے جا رہے تھے کہ اس کے لئے فرار کی کوئی راہ نہ رہے۔ اس پر میں نے ملک (ظہور) کی طرف عجیب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا، اور کہا کہ؎

زلف آوارہ، گریباں چاک، اے مستِ شباب!
تیری صورت سے تجھے دردِ آشنا سمجھا تھا میں

لیکن اب ان طعنوں طنزوں سے کیا حاصل تھا! لاچار دل کو سمجھانا پڑا کہ—— جب عشق کیا ہے تو صبر بھی کر، اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے؟

ان درسوں کی بنیاد پر پورے قرآن کی تفسیر! ۔۔۔۔ کہنے کو تو ایک فقرہ، لیکن کرنے کے لئے ایسی مہم جس کے لئے پوری کی پوری زندگی بھی شاید کافی نہ ہو سکے ـــــ درس کا انداز بالکل الگ ہوتا ہے۔ اس میں مختلف ذہنی سطح کے سامعین مخاطب ہوتے ہیں۔ انہیں سمجھانے کے لئے ایک ہی بات کو مختلف انداز میں بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ درس کے معنی ہی یہ ہیں۔ جب گندم کی فصل پک جاتی ہے تو اسے زمین پر بچھا دیتے ہیں اور اس پر دن بھر بیل چلاتے رہتے ہیں، تاآنکہ دانے، بھوسے سے الگ ہو جائیں۔ (ہمارے ہاں اسے گاہنا کہتے ہیں) اسے عربی زبان میں درس کہا جاتا ہے۔ اگر اس قسم کے درس، ضبطِ تحریر میں آ جائیں، تو ان سے کتاب مرتب کرنا، اوریجنل تصنیف سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ لیکن احباب کی شدتِ ذوق اس قسم کی دشواریوں کی کب متحمل ہو سکتی تھی۔ ان کا تقاضا بڑھتا گیا۔ میں جب ایک طرف اپنی عمر کو دیکھتا (کہ جس کی میں بہتر (۷۲) منزلیں طے کر چکا ہوں) اور دوسری طرف اس بحرِ بیکراں پر نگاہ ڈالتا، تو اس میں اترنے کی قطعاً ہمت نہ پاتا ـــ مہینوں، اسی "سوز و ساز رومی" اور "پیچ و تاب رازی" میں گذر گئے ـــــ کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔

اصنامیات یونان میں ایک افسانہ ہے کہ دور، سمندر کے اس پار، ایک جزیرہ ہے جس میں ایک پری رہتی ہے۔ جب وہ راتوں کی تنہائی میں، ایک حسین اور دلکش نغمہ الاپتی ہے، تو دور دور کی کشتیاں، اپنے راستے چھوڑ، اور منزلیں بھول، بلا اختیار و ارادہ اس کی سمت رواں دواں چل پڑتی ہیں۔ میں اس بحرِ زخار کے کنارے اسی تذبذب میں کھڑا تھا کہ افق کے اُس پار، کسی دلکش بے صوت صدا نے مجھے پکارا۔ میں اس نغمۂ جاں کے سحر کی تاب نہ لا سکا، اور "این و آں" سے بے نیاز بلا ارادہ اپنے آپ کو اس کی موجوں کے حوالے کر دیا۱۔ اُس وقت مجھے اس کا احساس ہوا کہ ؎

میری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اُٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

یہ فروری ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ میرے ہاتھ میں اب زیادہ وقت تک لکھنے کی طاقت نہیں رہی۔ یہ کمی میرے رفیق عزیز اخلاق احمد خان صاحب نے پوری کر دی۔ میں لکھواتا گیا وہ لکھتے گئے، اور قریب تین ماہ کے مختصر سے عرصہ میں، اس تفسیر کی پہلی جلد کا مسودہ

---

۱ اسے کسی قسم کے کشف و الہام پر محمول نہ کر لیا جائے۔ یہ اپنا ہی جذبۂ صادقہ ہوتا ہے، جو اس قسم کے دوراہوں پر، فیصلہ کرنے میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی اس سے، مقصد کی اہمیت کا احساس، راستہ کی دشواریوں کے خیال پر غالب آ جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

مرتب ہو گیا۔ اس کی کاپیوں اور پروف کی تصحیح کی صبر آزما ذمہ داری میرے دوسرے رفیقِ محترم سراج منیر صاحب کی دیدہ ریزی نے اپنے سر لے لی۔ قریب تین ماہ میں اس کی کتابت و طباعت کے مراحل بھی طے ہو گئے۔ اور آج میں اس قابل ہو گیا کہ شاخِ طوبیٰ کے اس برگِ سرسبز و شاداب کو آپ احباب کی نذر کر سکوں ــــ یہ لیجئے، مطالبُ الفرقان کی جلد اوّل ــــ اس کی ضخامت تو قریب پونے چار سو صفحات ہے، لیکن یہ مشتمل ہے سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی صرف ابتدائی انتیس آیات پر۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس میں، حقائق و معارفِ قرآنیہ کس شرح و بسط کے ساتھ منضبط ہو گئے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا انداز ایک درسی یا نصابی کتاب کا سا ہے۔ اعلیٰ پایہ کی نصابی کتابوں میں، ان تمام اساسی تصورات اور بنیادی مسلّمات کو جن سے کتاب میں بحث کی گئی ہو، شروع میں بیان کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد ان کی توضیحات و تشریحات بتدریج سامنے آتی جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے بھی اپنے بنیادی مسلّمات کو اپنے ابتدائی اوراق میں سمو دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک ان مسلّمات کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے، کتاب کی تعلیم سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ میں نے تفسیر کی اس جلد اوّل میں، ان مسلّمات کو بالوضاحت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ اگر غور و تدبّر سے اس کا مطالعہ کر لیا جائے تو پورے اسلام کا خاکہ نمایاں طور پر سامنے آ جائے گا۔ اس کے بعد جب ہم آگے بڑھیں گے، تو ان مسلّمات کی تفصیل کی ضرورت نہیں پڑے گی، اور اگلی جلدیں قرآنِ کریم کے نسبتاً زیادہ حصہ کو محیط ہوں گی۔

بہرکیف، میں نے بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا۔ (۱۱/۴۱) کہہ کر کشتی کو ڈھیل دیا ہے۔ یہ کہہ نہیں سکتا کہ یہ اگلے کنارے تک کب پہنچے گی۔ جو کچھ اس وقت تک ہوا ہے، مجھے تو اس کا بھی یقین نہیں آتا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ بس یوں سمجھئے کہ ؎

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

اور یہی ہے اس کتابِ عظیم سے میرے عشق کی وہ قوت جس کے سہارے میں جیتا ہوں، اور جس کی عطا کردہ قلندریت کی جرأت آفرینیوں کے بل بوتے پر، میں اس راہِ دور و دراز پر گامزن ہو گیا ہوں۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (۴۰/۴۴)

آپ احباب کو بھی اس وادیٔ مقدس کے بابرکت سفر کا آغاز مبارک ہو۔

والسلام

محترم پرویز صاحب

کی زندگی کا مشن، قرآنِ کریم پر، علم و بصیرت کی روشنی میں، غور و فکر کرنا، اور اُسے اسی طرح قوم کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے:

(۱) قرآنِ کریم کا ایک ضخیم اور منفرد لغت مرتب کیا جو چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

(۲) اس لغت کی روشنی میں پورے کے پورے قرآنِ مجید کا مفہوم مرتب کیا جو تیس پاروں (تین جلدوں) میں شائع ہو چکا ہے۔

(۳) پورے قرآنِ کریم کا انسائیکلوپیڈیا (تبویب القرآن) مرتب کیا، جو کتابت و طباعت کے مراحل طے کرنے کے بعد متعدد ضخیم جلدوں میں شائع ہوگا۔

(۴) قریب پینتیس سال سے، قرآن مجید کے مختلف موضوعات پر درجنوں نادر تصانیف شائع کر رہے ہیں۔

(۵) قریب بیس سال سے مسلسل درسِ قرآن دے رہے ہیں۔

اور اب انہوں نے، اس تمام تحقیق و کاوش کی روشنی میں، قرآن مجید کی تفسیر، خود قرآنِ مجید سے، کے مبارک سلسلہ کا آغاز کر دیا ہے جس کی پہلی جلد

مطالب الفرقان

کے نام سے کنونشن کی تقریب پر شائع کی گئی ہے۔ چونکہ یہ تفسیر اُن کی عمر بھر کی تمناؤں کا حاصل، اور فکری کاوشوں کا منتہیٰ ہے، اس لئے اسے شائع بھی نہایت ذوق و شوق سے کیا گیا ہے ـــــ سفید پرنٹنگ پیپر ـــــ آفسٹ کی چھپائی ـــــ حسین مطلّا جلد ـــــ ضخامت (۳۸۸) صفحات ـــــ قیمت فی جلد چالیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام، گلبرگ، لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش، اردو چوک، لاہور

باسمہ تعالیٰ

مودودی صاحب کی تفسیر
کی
چند جھلکیاں

محمد اسلام (کراچی)

(وہ مقالہ جسے طلوع اسلام کنونشن ۱۹۷۵ء میں پیش کیا گیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مودودی صاحب کی تفسیر کی چند جھلکیاں

دنیا کو اسلام سے برگشتہ ہی نہیں بلکہ متنفر کرنے کے لئے دانستہ یا نادانستہ جو کوششیں ہوئی ہیں، ان میں ہماری کتب تفسیر نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ تفسیر کی یہ کتابیں بالعموم اسرائیلیات کی خرافات، مجوسیوں کی لغویات اور خود ہمارے ہاں کی وضعی روایات کے تراشیدہ افسانوں سے بھری پڑی ہیں۔ کتب تفاسیر اس اعتبار سے زیادہ نقصان رساں ہیں کہ اگر کوئی مصنف کسی اور نام سے اپنی کتاب شائع کرتا ہے تو اس میں درج شدہ مضامین کے متعلق ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ مصنف کے خیالات ہیں۔ لیکن جب وہ اسی کتاب کو قرآن مجید کی تفسیر کہہ کر پیش کرتا ہے تو اس کے مندرجات کے متعلق غیر شعوری طور پر یہ تاثر پیدا ہوتا چلا جاتا ہے کہ وہ قرآن کی تعلیم ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ تفسیر ختم کرنے کے بعد قاری کے ذہن میں قرآن مجید کا عجیب و غریب تصور قائم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کے متعلق کتب تفاسیر کے پیدا کردہ یہی وہ تصورات ہیں جن سے، جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، دنیا اسلام سے برگشتہ ہی نہیں متنفر ہو جاتی ہے۔ موجودہ کتب تفاسیر کے یہی وہ اسقام تھے جن کے پیش نظر ہمارے دور میں ایک عرصہ سے ایک ایسی تفسیر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو ہر قسم کی خرافات اور لغویات سے پاک ہو۔ جو قرآن مجید کو اس کی اصلی شکل میں پیش کر سکے۔ اس میں ان اہم مسائل کا حل دیا گیا ہو جو ہمارے زمانے میں ابھرے ہیں، اور علوم حاضرہ کی تحقیقات اور مختلف سیاسی، معاشی معاشی تحریکات کا جائزہ قرآنی حقائق کی روشنی میں لیا گیا ہو۔ محترم سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس عزم کو لے کر اٹھے کہ وہ اس قسم کی تفسیر مرتب کریں گے جو ان تقاضوں کو پورا کر دے اور جس سے بالخصوص ہمارے ہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کا گرویدہ ہو جائے۔ یہ تفسیر تیس چالیس سال کے عرصہ دراز میں مکمل ہوئی اور چھ جلدوں میں شائع ہوئی۔ قبل اس کے کہ میں یہ عرض کروں کہ اس تفسیر کی پبلسٹی کس طرح کی گئی ہے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ خود

صاحب تفہیم مودودی صاحب کو دنیا کے سامنے کس رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ میں متعجب تھا کہ مودودی صاحب جیسی (بقول ان کے معاصرین کے) ہمہ گیر اور محیطِ کل شخصیت کا تعارف کن الفاظ میں کراؤں کہ میری یہ مشکل خود بخود انکے ایک معاصر، اسعد گیلانی صاحب نے حل کر دی انہوں نے مودودی صاحب کی زندگی سے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان "مولانا مودودیؒ" ہے یوں تو یہ ساری کتاب مودودی صاحب کے محاسن سے لبریز ہے لیکن اس کا ایک باب انکی امتیازی خصوصیات سے متعلق آراء پر مشتمل ہے۔ اس باب کی جو سرخیاں کتاب کی فہرست میں دی گئی ہیں، میں ان میں سے چند ایک یہاں درج کرتا ہوں۔ ان سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ انھیں دنیا کے سامنے کس لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ عنوانات ہیں:۔ باکمال شخصیت۔ مفکرِ ملت۔ بلند فطرت۔ اسلامی اجتماعیات کا ماہر۔ الحاد و شکیک کا معالج۔ علم کا بحرِ ذخار۔ اسلام کا محسن۔ ابنِ تیمیہ کا رنگ۔ عالمِ اسلام کا ہیرو۔ انقلابی شخصیت۔ عظیم اسکالر۔ بے مثال مفکرِ اسلامی، جدید و قدیم کا شاہسوار۔ ملت کا متاعِ گراں مایہ۔ اسلامی دنیا کی منفرد شخصیت۔ اسلام کا فلسفیِ اعظم۔ امام احمدؒ بن حنبل کا ثانی۔ دورِ حاضر کا مجتہد۔ عالمِ اسلام کی امانت۔ فقیہہ ملت، متاعِ بے بہا۔ مفسرِ قرآن (صفحہ ۱۰-۹)

اور اس میں اضافہ کر لیجئے اس جدید ترین لقب کا جو حال ہی میں وضع کیا گیا ہے یعنی "اللہ کا شاہکار۔ مودودی"۔ جس عظیم مفسر کو ان تعارفات کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے اس کی اس چھ جلدوں پر پھیلی ہوئی تفسیر کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے۔ ویسے تو اگر میں اس تفسیر کا تفصیلی جائزہ لینے بیٹھوں تو اس کے لئے ایک ضخیم جلد بھی کفایت نہیں کرے گی۔ لیکن قلتِ وقت کی بنا پر سردست اس کی صرف انہی مثالوں پر اکتفا کروں گا، غور سے سنئے۔

(۱) ہاروت و ماروت

قرآنِ کریم کے پہلے پارے میں ہاروت و ماروت کا ذکر آتا ہے۔ ہمارے ہاں انکے متعلق عجیب و غریب قصے زبان زدِ خلائق ہیں، جنھیں ہمارے واعظ جھوم جھوم کر بیان کرتے رہتے ہیں۔ یہ عام واعظوں ہی کی بات نہیں، ہماری کتب تفاسیر بھی اس قسم کے افسانوں سے بھری پڑی ہیں۔ انھیں اسرائیلیات پر مبنی خرافات کہہ کر پکارا جاتا ہے یعنی وہ بے سروپا قصے، جو ہمارے ہاں یہودیوں کی سازش سے عام ہو چکے ہیں۔ اور انتہائی بدقسمتی کہ ان وضعی روایات کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر ہمارے ہاں بڑی معتبر تصور کی جاتی ہے۔ اس میں ہمیں حسبِ ذیل روایت نظر آتی ہے:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا اور ان کی اولاد پھیلی اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہونے لگی تو فرشتوں نے کہا کہ دیکھو یہ کس قدر برے لوگ ہیں، کیسے نافرمان اور سرکش ہیں! ہم اگر انکی جگہ ہوتے تو ہرگز ہرگز خدا کی نافرمانی نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتے پسند کرلو۔ میں ان میں انسانی خواہشات پیدا کرتا ہوں اور انھیں دنیا میں بھیجتا ہوں۔ پھر دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہاروت و ماروت کو پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں انسانی طبیعت پیدا کی اور ان سے کہہ دیا کہ دیکھو! بنی آدم کو تو میں نبیوں کی معرفت اپنے حکم احکام پہنچاتا ہوں لیکن تم سے بلا واسطہ خود کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، زنا نہ کرنا۔ شراب نہ پینا۔ اب یہ دونوں زمین پر اترے اور زہرہ (ستارے) کو ان کی آزمائش کے لئے حسین و شکیل عورت کی صورت میں ان کے پاس بھیجا جسے دیکھ کر یہ مفتون ہو گئے اور اس سے زنا کرنا چاہا۔ اس نے کہا اگر تم شرک کرو تو میں منظور کرتی ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو ہم سے نہ ہو سکے گا۔ وہ چلی گئی پھر آئی اور کہنے لگی۔ اچھا اس بچے کو قتل کر ڈالو تو مجھے تمہاری خواہش پوری کرنی منظور ہے۔ انہوں نے اسے بھی نہ مانا۔ وہ پھر آئی اور کہا کہ اچھا یہ شراب پی لو۔ انہوں نے اسے ہلکا گناہ سمجھ کر اسے منظور کرلیا۔ اب نشہ میں مست ہو کر زنا کاری بھی کی اور اس بچہ کو بھی قتل کر ڈالا۔ جب ہوش و حواس درست ہوئے تو اس عورت نے کہا، جن جن کاموں کا تم پہلے انکار کرتے تھے، سب تم نے کر ڈالے۔ یہ نادم ہوئے۔ انہیں اختیار دیا گیا کہ یا تو عذاب دنیا کو اختیار کرو یا عذاب اخروی کو۔ انہوں نے عذاب دنیا کو پسند کیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس عورت نے ان سے

یہ بھی کہا کہ تم کیا پڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہو اور کیا پڑھ کر اترتے ہو۔ انہوں نے یہ بھی بتا دیا۔ چنانچہ وہ اسے پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی۔ لیکن اترنے کا وظیفہ بھول گئی اور وہیں ستارے کی صورت میں مسخ کر دی گئی۔ اس کے بعد ان فرشتوں نے چڑھنا چاہا تو نہ چڑھ سکے۔

اس کے بعد یہ فرشتے لوگوں کو جادو سکھانے لگے۔ اگرچہ ہماری بعض کتب تفاسیر میں یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ ان میں سے اکثر روایات ضعیف ہیں لیکن اس کے باوجود قرآن کریم کی متعلقہ آیات کا ترجمہ بھی انہی سے متاثر ہو کر کیا جاتا ہے اور ان کی تفسیر میں ان قصوں کو دہرایا جاتا ہے مودودی صاحب نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ ایسی تفسیر پیش کر رہے ہیں جو اس قسم کی لغویات سے پاک ہے لیکن دیکھئے کہ وہ اس سلسلے میں کیا لکھتے ہیں۔ وہ سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر ۱۰۲ کا ترجمہ ان الفاظ سے کرتے ہیں :-

(حضرت) سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا۔ کفر کے مرتکب تو شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیچھے پڑے اُس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی۔ حالانکہ وہ فرشتے جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ دیکھ ہم ایک آزمائش میں ہیں۔ تو کفر میں مبتلا نہ ہو۔ پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ (تفہیم القرآن جلد اوّل طبع اوّل صفحہ ۹۸)

اس ترجمہ کے نیچے وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :-

اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں، مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لئے بھیجا ہوگا۔ جس طرح قوم لوطؑ کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے اسی طرح ان اسرائیلیوں پر وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازارِ سحر کی

میں اپنی دکان لگائی ہوگی اور دوسری طرف وہ اتمام حجت
کے لئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم
تمہارے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت
خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ
عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہونگے (صفحہ ۹۸)

میں اس وقت نہ تو قوم لوطؑ کے قصے کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں نہ اس حقیقت کے متعلق کہ کیا فرشتے انسانی شکل اختیار کر سکتے ہیں میں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ مودودی صاحب بھی یہی تفسیر پیش کرتے ہیں کہ ان فرشتوں کو خود اللہ تعالیٰ نے انسانی شکل میں بنی اسرائیل کی آزمائش کے لئے بھیجا۔ وہ انہیں جادو کی تعلیم دیتے تھے جسے قرآن کریم نے اسی آیت میں کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ کہ یہ فرشتے اتمام حجت کے لئے انھیں خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے جو تم کرو گے۔

یہ ہے مودودی صاحب کی تفسیر۔ لیکن چونکہ وہ مفسر ہی نہیں، نہایت بلند پایہ "مفکر" بھی ہیں۔ اس لئے وہ اپنی تفسیر کے لئے دلیل بھی ساتھ دیتے ہیں۔ ان کی دلیل ملاحظہ فرمایئے لکھتے ہیں:

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت
نہ ہو وہ سلطنت الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کے
سلسلہ میں جس وقت، جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہو اُسے
اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و
پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں گے۔
رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بری تھی
تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی
کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر
رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اُسے عین حالت ارتکاب جرم
میں پکڑیں اور اس کے لئے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ
رہے۔ (صفحہ ۹۵)

آپ نے وہ دلیل ملاحظہ فرمائی جسے یہ عظیم مفکر قرآنی حقائق کی صداقت کی تائید میں دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اور اس پر بھی غور فرمایا کہ اس سے خود خدا کے متعلق کیا تصور سامنے آتا ہے؟۔

اور یہ معلوم کرکے آپ حیران ہوں گے کہ یہ اُس قرآنی آیت کی تفسیر اور تاویل کے سلسلے میں کہا جا رہا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ یہ سب افسانے ہیں جو یہودیوں کے وضع کردہ تھے۔ نہ خدا نے بابل میں ہاروت و ماروت نامی کوئی فرشتے بھیجے تھے نہ وہ لوگوں کو جادو وغیرہ سکھاتے تھے۔ پرویز صاحب نے مفہوم القرآن میں یہ کہنے کے بعد کہ یہودیوں نے کس قسم کے افسانے تراش رکھے تھے، لکھا ہے کہ:۔

> ان میں ایک افسانہ یہ بھی تھا (جو انھوں نے مشہور کر رکھا تھا) کہ بابل میں دو فرشتے تھے۔ ہاروت و ماروت۔ ان پر خدا نے اس علم (جادو) کو نازل کیا تھا۔ لوگ ان کے پاس جاکر اس قسم کے تعویذ گنڈے سیکھتے جن سے میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہو جاتے۔ لیکن وہ (فرشتے) یہ کچھ سکھانے سے پہلے لوگوں سے صاف صاف کہہ دیتے کہ بھائی! ہم تو ایک فتنہ ہیں۔ تم یہ کچھ سیکھ کر کیوں کافر بنتے ہو (لیکن اس کے باوجود لوگ ان سے یہ باتیں سیکھتے۔ ان باتوں میں لذت ہی ایسی ہوتی ہے)
>
> لیکن یہ سب افسانہ ہے۔ نہ بابل میں اس قسم کے کوئی فرشتے تھے اور نہ ہی خدا نے انھیں کوئی باطنی علم سکھایا تھا۔ یہ سب ان لوگوں کی خود ساختہ کہانیاں ہیں۔
>
> (مفہوم القرآن۔ صفحہ ۳۶)

(۲) داستانِ حضرت یوسف علیہ السلام

قرآن کریم میں داستانِ حضرت یوسف علیہ السلام میں ایک مقام وہ آتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی غلّہ لے کر روانہ ہونے لگے تو کارپردازانِ حکومت نے دیکھا کہ شاہی پیمانہ غائب ہے۔ انہوں نے انھیں روک لیا۔ اُن کی بوریوں کی تلاشی لی۔ حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یامین کی بوری سے وہ پیمانہ برآمد ہوا اس بنا پر وہ چوری کے جرم کے مرتکب ٹھہرائے گئے اور رائج الوقت قانون کی رو سے انھیں وہیں روک لیا گیا۔ جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ قرآنِ کریم کی آیات پر غور کرنے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ کارروائی حضرت یوسفؑ کے سوتیلے بھائیوں میں سے کسی ایک

نے کی تھی، اِس نیت سے کہ اگر اس کا پتہ نہ چلا تو ایک قیمتی کٹورہ مفت میں ہاتھ لگ جائے گا اور اگر چوری کا پتہ چل گیا تو بن یامین بدنام ہو جائے گا اور اس طرح انھیں باپ سے یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ جس بیٹے کو آپ اپنی آنکھوں کا تارا قرار دیتے ہیں اس کی یہ کرتوت ہے۔ پرویز صاحب نے مفہوم القرآن میں ان آیات کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

لیکن دیکھئے: مودودی صاحب اِسکی تفسیر میں کیا فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی دوسرے بھائیوں کے ساتھ مصر میں آئے ہیں تو حضرت یوسفؑ کا جی چاہتا تھا کہ انہیں اپنے پاس رکھیں لیکن مملکت کا قانون یہ تھا کسی غیر ملکی کو کسی جرم کے بغیر روکا نہیں جا سکتا۔ اس مشکل کے حل کے لئے حضرت یوسفؑ نے ایک اسکیم یہ تیار کی کہ کسی نہ کسی طرح اپنے بھائی کو مجرم ٹھہرا کر اسے روک لیا جائے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

> دونوں بھائیوں میں مشورہ ہوا ہو گا (یعنی بن یامین کو چور بنانے کا) کہ اسے روکنے کی تدبیر کی جائے۔ اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے اس میں بھائی کی سُبکی تھی کہ اس پر چوری کا دھبہ لگتا تھا لیکن بعد میں یہ دھبہ اس طرح آسانی سے دھل سکتا تھا کہ دونوں بھائی اصل معاملہ کو دنیا پر ظاہر کر دیں۔

(تفہیم القرآن۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۱۹۔ بحوالہ طلوع اسلام جنوری ۱۹۶۲ء صفحہ ۶۲)

چنانچہ اس اسکیم کے مطابق، مودودی صاحب کی تفسیر کی رو سے، حضرت یوسفؑ نے بن یامین کے تھیلے میں اپنا شاہی کٹورہ رکھ دیا۔ پھر اسے پکڑ لیا اور اس طرح چوری کے جرم میں اپنے بھائی کو اپنے پاس روک لیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب خدا کے ایک اولوالعزم رسول کی سیرت کا کس قسم کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں! یوں تو رسول ہوتے ہی صادق اور صدیق تھے۔ ان کے دعوائے نبوت کی اوّلین شہادت یہی ہوتی تھی کہ معاشرہ انہیں جانتا تھا کہ انہوں نے کبھی جھوٹ اور فریب سے کام نہیں لیا۔ لیکن حضرت یوسفؑ کے متعلق تو اس کی خصوصی شہادت خود قرآن مجید میں ہے اور وہ بھی ایک ایسے شخص کی زبانی جو چند دنوں کے لئے قیدی کی حیثیت سے حضرت یوسفؑ کے ساتھ جیل خانہ میں رہا۔ اُس نے وہاں انکی سیرت و کردار کا جو مطالعہ کیا تو انہیں مخاطب ہی یہ کہہ کر کیا یُوسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ (۱۲/۴۶) "اے یوسفؑ! اے مجسم صداقت!" مجھے یہ بتا کہ" یہ تھا اُس شخص کا تاثر جو حضرت یوسفؑ کو محض ایک قیدی کی حیثیت سے جانتا تھا اور دوسری طرف ان کی سیرت و کردار کے متعلق مودودی صاحب

اس قسم کا سرٹیفکیٹ عطا فرما رہے ہیں۔ اور اس کے بعد اگر جرأت عرض معاف ہو تو اسے بھی سوچیے کہ جو شخص خدا کے رسولوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ وہ اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے اس قسم کے حربے بھی اختیار کر لیا کرتے تھے۔ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اس قسم کے حربوں میں کیا جھجک محسوس کرے گا؟ اسی کا نتیجہ ہے کہ مودودی صاحب نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہے۔ جماعت سازی کے وقت دنیا کے سامنے جو بلند آہنگ اصول پیش کئے جائیں حصولِ اقتدار کے وقت انھیں بلا تامل بالائے طاق رکھ دیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ اپنے مخالفین کو فریب دے کر قتل کرایا جا سکتا ہے؟ اور ان کی جسارت کا یہ حال ہے کہ اور تو اور، حضور رسالتمآب کے متعلق کہا ہے کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) آپؐ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن، بابت مئی ۱۹۵۸ء)

ضمناً مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ "بعد میں یہ دھبہ اس طرح آسانی سے دھل سکتا تھا کہ دونوں بھائی اصل معاملہ کو دنیا پر ظاہر کر دیں" لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا ان دونوں بھائیوں نے اس معاملہ کو کب اور کس طرح دنیا پر ظاہر کیا تھا۔

اب اس تفسیر کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

(۳) بوڑھے زانی کی سزا

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ زانی مرد اور زانی عورت میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگائے جائیں (۲۴/۲)۔ مودودی صاحب اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:-

> اگر مجرم مریض ہو اور اس کے صحت یاب ہونے کی امید نہ ہو، یا بہت بوڑھا ہو تو سو شاخوں والی ایک ٹہنی یا سو تیلیوں والی ایک جھاڑو لیکر صرف ایک دفعہ مار دینی چاہیئے تاکہ قانون کا تقاضہ پورا کر دیا جائے (تفہیم القرآن۔ جلد سوم۔ صفحہ ۳۴۱۔ بحوالہ طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۷۳ء)

آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے دور کے اس عظیم مقنن نے قانون کا تقاضہ پورا کرنے کی کیا شکل تجویز فرمائی ہے؟ ہمیں امید ہے کہ ہماری ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان نے اسے خاص طور پر نوٹ فرما لیا ہوگا، بالخصوص اس لئے کہ اب اس مملکت میں اسلامی قوانین رائج ہونے جا رہے ہیں۔ اور ان اربابِ شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ ان

قوانین کو انہی سے مرتب کرایا جائے۔ اس قسم کے ہوں گے وہ قوانین، جنھیں یہ حضرات مرتب فرمائیں گے، اور پھر دنیا اسلام کے ضابطۂ قوانین کو دیکھ کر عش عش کر اٹھے گی۔

(۴) قصۂ حضرت داؤد علیہ السلام

نظامِ سرمایہ داری میں ہوتا یہ ہے کہ بڑا سرمایہ، چھوٹے سرمایہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس طرح امیر، امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے سرمایہ داروں کے اسی قسم کے ہتھکنڈوں کو اس مقدمہ کی شکل میں پیش کیا ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے لایا گیا تھا۔ اسے قرآنِ کریم نے سورۃ ص کی آیات ۲۱-۲۴ میں بیان فرمایا ہے۔ اسے ہم پہلے پرویز صاحب کے مفہوم القرآن سے نقل کرتے ہیں اس میں کہا گیا ہے:

> مستغیث نے حضرتِ داؤدؑ سے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے لیکن دیکھئے کہ یہ بھائی ہو کر مجھ سے کس قسم کا برتاؤ کرتا ہے۔ اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں۔ اس لئے بڑا خوش حال ہے اور میرے پاس صرف ایک دُنبی ہے جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ (اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ مدد کرے) مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دُنبی بھی مجھے دیدو۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحبِ اثر اس لئے) باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ یہ ہے میرے اس بھائی کا رویہ آپ بتائیے کہ اس کا مطالبہ جائز ہے یا ناجائز۔
>
> (حضرت) داؤدؑ نے کہا کہ اس شخص کا یہ مطالبہ کہ اپنی ننانوے دنبیوں کو سو بنالے اور تیرے پاس ایک دُنبی بھی نہ رہے، سراسر ظلم اور زیادتی پر مبنی ہے۔
>
> حقیقت یہ ہے کہ لوگ جب بھی مل جل کر رہتے ہیں یا باہمی شراکت سے کام کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ دوسروں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ ایسا کچھ وہ لوگ نہیں کرتے جو قوانین خداوندی پر ایمان رکھتے ہیں

اور معاشرہ کو سنوارنے والے کام کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ
بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ابتدا میں یہودیوں کے ہاں اسی طرح مذکور ہوگا۔ لیکن بعد میں جب ان میں سرمایہ داری کی لعنت شروع ہوئی تو انہوں نے ان تمام احکام، ہدایات اور نظائر میں تحریف کر دی جو نظام سرمایہ داری کے خلاف تھے اور اس قسم کے واقعات کو ایسا افسانوی رنگ دیا کہ ۔ حقیقت خرافات میں کھو گئی۔

مودودی صاحب نے اس واقعہ کو اپنی کتاب تفہیمات، جلد دوم میں اس طرح بیان کیا ہے۔ دوسرا زبردست داغ، جو حضرت داؤدؑ کی سیرت پر یہودیوں نے لگایا ہے، اُوریاحتی کی بیوی کے معاملہ میں ہے۔ کتاب صموئیل دوم باب گیارھواں میں اس کی پوری تفصیل درج ہے جس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ایک روز شام کے وقت داؤد اپنے محل کی چھت پر
ٹہل رہا تھا کہ اس کی نظر ایک عورت پر پڑی جو نہا رہی
تھی۔ بے حد خوبصورت عورت تھی۔ داؤد نے دریافت
کرایا کہ یہ کون ہے۔ معلوم ہوا کہ..... وہ اُوریاحتی کی بیوی
ہے۔ داؤد نے اس کو بلا بھیجا اور رات اپنے پاس رکھا
اور اسی رات وہ حاملہ ہو گئی اور بعد میں داؤد کو اس
نے اپنے حمل کی اطلاع دے دی۔ اس کے بعد داؤد
نے اس کے شوہر کو یوآب کے پاس بھیج دیا اور اس کو
لکھا کہ اُسے جنگ میں کسی ایسی جگہ پر مامور کر دے جہاں
سخت معرکہ ہو اور پھر اس کو اکیلا چھوڑ کر الگ ہو جائے تاکہ
وہ مارا جائے۔ چنانچہ یوآب نے ایسا ہی کیا اور وہ لڑائی
میں مارا گیا۔ اس طرح اوریا کو ٹھکانے لگانے کے بعد
داؤد نے اس عورت سے نکاح کر لیا اور اس کے
پیٹ سے سلیمان پیدا ہوا۔

خدا کو داؤد کا یہ فعل ناگوار ہوا اور اس نے ناتن
نبی کو داؤد کے پاس بھیجا۔ ناتن نے اس سے کہا کہ ایک
شہر میں دو شخص تھے ایک مالدار تھا دوسرا فقیر۔ مالدار

شخص کے پاس بہت سی بکریاں اور گائیں تھیں، فقیر کے پاس صرف ایک چھوٹی سی دنبی تھی جس کو وہ بڑی محبت سے پالتا تھا۔ ایک مرتبہ مالدار شخص کے پاس کچھ مہمان آئے اس نے نہ چاہا کہ اپنی بکریوں اور گایوں میں سے کسی کو کاٹے۔ فقیر کی دنبی لے لی اور اس سے ضیافت کا سامان کیا۔ یہ قصہ سن کر داؤد بہت غضب ناک ہوا اور کہا کہ ایسا شخص ضرور سزا پائے گا اور اس فقیر کو ایک کے بدلے چار دنبیاں دلوائی جائیں گی۔ ناتن نے کہا کہ وہ شخص تو ہی ہے اور اسے اوریا حتی کا واقعہ یاد دلایا۔ (صفحہ ۳۴)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ "اس قصہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کے اخلاق کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے جو ایک نبی تو درکنار، ایک معمولی بادشاہ کے لئے بھی انتہائی شرمناک ہے" ایضاً۔

اس تمہید کے بعد آئیے ان کی تفسیر کی طرف۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

اصل واقعہ جو قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا (یا جو کچھ بھی اس شخص کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنے بیوی کو طلاق دیدے اور چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرماں روا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی، اس لئے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔ اس موقع پر قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤدؑ کی فرمائش کی تکمیل کرتا قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے ایک فرضی مقدمہ کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت داؤد ابتدا میں تو یہ سمجھے کہ واقعی یہ کوئی مقدمہ ہے چنانچہ

انہوں نے اسے سن کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ لیکن زبان سے
فیصلہ کے الفاظ نکلنے ہی ان کے ضمیر نے تنبیہ کی کہ یہ تمثیل
پوری طرح ان کے اور اُس شخص کے معاملہ پر چسپاں
ہوتی ہے اور جس فعل کو وہ ظلم قرار دے رہے ہیں
اس کا صدور خود اُن سے اُس شخص کے معاملہ میں ہو رہا
ہے۔ یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدے میں
گر گئے۔ اور توبہ کی اور اپنے فعل سے رجوع فرما لیا۔
(تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۳۲۸ بحوالہ طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۷۳ء)

مودودی صاحب کی اس تفسیر میں (اگر اسے تفسیر کہا جا سکے تو) حسب ذیل نکات غور طلب ہیں

(۱) انہوں نے لکھا ہے کہ "اصل واقعہ جو قرآنِ مجید کے مذکورہ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے۔ قرآنِ کریم میں نہ کسی عورت کا ذکر ہے نہ اُس کے خاوند کا۔ نہ حضرت داؤد کی طرف سے اُسے طلاق دینے کی خواہش کا۔ ان میں سے کسی بات کا صراحتاً تو ایک طرف، اشارۃً یا کنایتاً بھی کوئی ذکر قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آیا۔ تورات کا یہ افسانہ ہے جس کے متعلق مودودی صاحب کہتے ہیں کہ یہ بات قرآنِ مجید سے صاف سمجھ میں آتی ہے۔ آپ فرمائیے کہ اسے تفسیر کہیں گے یا تحریف!

(۲) مودودی صاحب اس تحریف کی رو سے خدا کے ایک اولوالعزم رسول کی طرف یہ اتہام منسوب کرتے ہیں کہ اس نے اپنی رعایا میں سے ایک شخص سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے تاکہ یہ اس سے نکاح کر سکیں۔ مودودی صاحب کے نزدیک کسی شخص سے یہ کہنا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دیدو تاکہ میں اُسے اپنی بیوی بنا سکوں بالکل معمولی بات ہے، جس پر کسی قسم کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ لیکن سنیئے کہ خود مودودی صاحب کے نزدیک ایسا کرنا اخلاق و شرافت کے معیار پر کہاں قرار پاتا ہے۔ قصۂ ہاروت و ماروت میں یہ کہا گیا ہے کہ لوگ ان سے وہ کچھ سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ آپ دیکھئے کہ مودودی صاحب اس پر کیا تبصرہ کرتے ہیں لکھتے ہیں:-

مطلب یہ ہے کہ اس منڈی میں سب سے زیادہ جس
چیز کی مانگ تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے

جس سے ایک آدمی دوسرے کی بیوی کو توڑ کر
اپنے اوپر عاشق کرلے۔ یہ اخلاقی زوال کا وہ انتہائی
درجہ تھا جس میں وہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست
اخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا مرتبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا
کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ
مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے۔ اور کسی
منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو
وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگے۔

ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کی جڑ ہے۔
عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدن
کی درستی کا اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدن کی
خرابی کا مدار ہے۔ لہٰذا وہ شخص بدترین مفسد ہے جو
اُس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتا ہے جس کے قیام پر
خود اس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ حدیث
میں آتا ہے کہ ابلیس اپنے مرکز سے زمین کے ہر گوشہ
میں اپنے ایجنٹ روانہ کرتا ہے پھر وہ ایجنٹ واپس
آکر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے
میں نے فلاں فتنہ برپا کیا۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں
شر کھڑا کیا۔ مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے
کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں
ایک عورت اور اس کے شوہر میں جدائی ڈال آیا
ہوں۔ یہ سنکر ابلیس اس کو گلے سے لگا لیتا ہے اور
کہتا ہے کہ تو کام کر کے آیا ہے۔

(تفہیم القرآن، جلد اول صفحہ ۹۹)

آپ نے غور فرمایا کہ خود مودودی صاحب کے نزدیک کسی بستے رستے گھر کو اجاڑنا اور میاں بیوی میں جدائی ڈالنا کس قدر گھناؤنا جرم ہے۔ وہ اسے اخلاقی زوال کا انتہائی درجہ، پست اخلاقی کا سب سے نیچا مرتبہ، ابلیس کا کامیاب ترین

اور اس کے لئے مسرت آفرین عربہ قرار دیتے ہیں اور ایسا کرنے والے کو بدترین مفسد ٹھہراتے ہیں۔ اس کے بعد آپ خود ہی اندازہ فرمایئے کہ وہ خدا کے ایک عظیم پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کو کس مقام پر لے جاکر کھڑا کر رہے ہیں اور ایسا کرنے میں نہ خدا کی شرم محسوس کرتے ہیں نہ اس کے رسولوں کی طرف سے کوئی حیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "پست اخلاق کا اس سے زیادہ نیچا مرتبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا" اور رسولوں کی توقیر اور احترام کا جذبہ ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ پست اخلاق کا اس سے بھی زیادہ نیچا مرتبہ ایک اور ہے اور وہ یہ کہ اس قسم کے شرمناک الزامات خدا کے رسولوں کے خلاف عائد کئے جائیں۔

مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ "چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرماں روا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی اس لئے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا" یعنی ان کے نزدیک خدا کے ایک رسول کی قائم کردہ حکومت میں بھی رعایا کی یہ حالت تھی کہ اگر وہ فرماں روا کسی شخص سے کہتا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دیدو تاکہ میں اسے اپنی بیوی بنالوں تو اس شخص میں اتنی جسارت نہ ہوتی کہ وہ اس سے انکار کر سکے، وہ اس فرمائش کو قبول کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا۔ غور کیجئے کہ اس حکومت میں اور کسی فرعون صفت بادشاہ کی حکومت میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ مودودی صاحب غالباً اسی قسم کی حکومتِ خداوندی پاکستان میں قائم کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

(۴) مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ "قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤد کی فرمائش کی تعمیل کرتا، قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤد کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے ایک فرضی مقدمہ کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا" پہلے تو یہ غور کیجئے کہ ان دو آدمیوں کو مودودی صاحب نیک قرار دیتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ جو لوگ حضرت داؤد کو سمجھانے کے لئے گئے تھے وہ نیک تھے تو جنہیں سمجھانے کے لئے یہ گئے تھے انہیں کیا کہا جائیگا۔؟ (استغفراللہ)

اس کے بعد یہ سوچئے کہ حضرت داؤد (معاذاللہ معاذاللہ) اپنے جنسی جذبات سے ایسے ہی مغلوب ہو گئے تھے کہ ان کی سمجھ میں وہ بات بھی نہ آسکی جو قوم کے دو عام نیک آدمیوں کی سمجھ میں آگئی کہ حضرت داؤد کا یہ اقدام کس قدر قابلِ مذمت ہے۔

اور تیسری بات یہ کہ حضرت داؤدؑ کے استبداد کا یہ عالم تھا کہ یہ بھی انھیں کھلے الفاظ میں نہ کہہ سکے کہ وہ اس خیال سے باز آجائیں۔ انھوں نے بھی اسی میں مصلحت سمجھی کہ اسے ایک فرضی مقدمہ کی شکل میں پیش کیا جائے۔ اور پھر حضرت داؤد علیہ السلام کی فراست کا یہ عالم کہ وہ اس سے بھی یہ بھانپ نہ سکے کہ ان لوگوں کا اشارہ کس طرف ہے۔ انہوں نے اس مقدمے کو حقیقی سمجھ کر فیصلہ صادر کر دیا اور اس کے بعد اس کا احساس ہوا کہ یہ کیا ہوگیا۔

اور یہ کچھ اُس پیغمبر کے متعلق کہا جارہا ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کہا ہے کہ:- وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (۳۸/۲۰) ہم نے اُسے حکمت بھی عطا کی تھی اور معاملات میں ٹھیک، ٹھیک فیصلہ کرنے کا فہم بھی۔ اور ان سے کہا تھا کہ:- ہم نے تجھے ملک میں اس لئے صاحب اقتدار بنایا ہے کہ تو لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرے" (۳۸/۲۶)

اور ابھی ٹیپ کا بند تو آپ نے سنا ہی نہیں۔ وہ بھی سن لیجئے۔ یہ سب کچھ کہہ لینے کے بعد بھی مودودی صاحب کے دل میں یہ کھٹک رہی کہ حضرت داؤدؑ کا یہ فعل بہرحال ان کی لغزش تھی جس پر انہیں خود بعد میں ندامت ہوئی۔ ایک رسول سے اس قسم کی لغزش کے لئے کیا راہ جواز تلاش کی جائے۔ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس قسم کی لغزشوں کا انتساب، عصمت انبیاء کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

> لیکن ان حضرات نے شاید اس امر پر غور نہیں کیا کہ عصمت دراصل انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہوجائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہوسکتی ہے اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی کو کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہیں تاکہ لوگ انبیا کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں ہیں۔ (تفہیمات حصہ دوم ص۴۳)

غور فرمائیے کہ مودودی صاحب حضرت داؤدؑ کی لغزش کا جواز پیش کرتے کرتے، کس طرح

جملہ انبیاء کرام اور خود ذاتِ باری تعالیٰ کو کس لپیٹ میں لے گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ انکے نزدیک حضرات انبیاء کرام کی سیرت ایسی بلند نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے معصیت سے مجتنب رہیں، انھیں خدا مصلحتہً لغزشوں سے محفوظ رکھتا تھا۔ اگر ان سے خدا کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی اُٹھ جاتی تو وہ عام انسانوں کی طرح لغزشیں کرنے لگ جاتے۔ یہ ہے حضرات انبیاء کرامؑ کی سیرت و کردار کا وہ نقشہ جسے مودودی صاحب پیش فرما رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ، حضرات انبیاء کرامؑ تو ایک طرف اپنے عام بندوں کے متعلق بھی تحدّی سے کہتا ہے کہ ان پر شیطان غلبہ نہیں پا سکتا۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲)

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ بالارادہ ہر نبی سے ایک دو لغزشیں سرزد کرا دیا کرتا تھا معاذ اللہ معاذ اللہ۔ اب سوچئے کہ ایسے خدا کے متعلق کیا کہا جائیگا جو اور تو اور خود اپنے رسولوں سے بالارادہ لغزشیں سرزد کرا دے۔ اور اس سے ان (معاذ اللہ) بیچارے رسولوں کی حالت پر بھی آپ نے غور فرمایا کہ وہ کس قدر قابلِ رحم ہے۔ ان سے لغزشیں خدا سرزد کراتا تھا اور بدنام انھیں ہونا پڑتا تھا، اور وہ کسی سے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ یہ تو ہم سے خدا سرزد کراتا ہے۔!

یعنی رسولوں کی یہ کیفیت کہ اگر وہ لغزشوں سے بچتے تھے تو اس لئے نہیں کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے پاکباز زندگی بسر کرتے تھے، بلکہ اس لئے کہ انھیں خدا لغزشوں سے محفوظ رکھتا تھا۔ اگر خدا کی حفاظت اُٹھ جاتی تو وہ وہی کچھ کرنے لگ جاتے جو عام انسان کرتے ہیں۔ باقی رہیں ان کی لغزشیں تو وہ ان سے زبردستی سرزد کرا دیتا تھا! یعنی ان کی نیک عملی ان کے ذاتی کردار کا نتیجہ ہوتی تھی، نہ لغزشیں اپنے اختیار کی بات۔ وہ دونوں میں مجبور تھے! لغزشیں خود خدا سرزد کراتا تھا، اور پھر ان سے کہتا تھا کہ تم اعلان کرو کہ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵) مجھ سے اگر معصیت ہو جائے تو میں بھی عذاب کے یوم عظیم سے ڈرتا ہوں" یعنی وہ دنیا سے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ان لغزشوں کے ہم ذمہ دار نہیں۔ یہ ہم سے خدا سرزد کراتا ہے" وہ بحکم خداوندی دنیا سے یہ کہنے پر مجبور ہوتے تھے کہ ہم ان لغزشوں کی بنا پر ہونے والے عذاب خداوندی سے ڈرتے ہیں۔ مودودی صاحب نے خود حضرت داؤدؑ کے متعلق لکھا ہے کہ:-

> جب انھیں اس کا احساس ہوا کہ ان سے کتنی بڑی لغزش سرزد ہو گئی ہے تو" وہ سجدے میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے فعل سے رجوع فرما لیا"

سوال یہ ہے کہ اگر انبیاء کرامؑ کو اس کا علم ہوتا تھا کہ یہ لغزشیں خود خدا ان سے بالارادہ کرا رہا ہے تو توبہ اور رجوع فرمالینے کا مطلب کیا؟ کیا وہ (معاذ اللہ) محض دنیا کو دکھانے کے لئے ایسا کرتے تھے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو یہ ماننا پڑیگا کہ خدا انھیں یہ نہیں بتاتا تھا کہ ہم تم سے یہ لغزشیں خود سرزد کراتے ہیں اور وہ اسی خیال میں رہتے تھے کہ ان لغزشوں کے ذمہ دار وہ خود ہیں جبھی تو وہ ان سے توبہ کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اس اقدام سے رجوع کر لیا تھا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جو لغزش خدا ان سے سرزد کرانا چاہتا تھا، انہوں نے اس کا ارادہ تو ضرور کیا لیکن عملاً اسے سرزد نہیں ہونے دیا؟ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس طرح (معاذ اللہ) خدا کی اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی۔ حضرت داؤدؑ نے وہ لغزش ہونے ہی نہیں دی یا

اور اگلی بات یہ کہ خدا یہ لغزشیں کس لئے سرزد کراتا تھا؟ اس لئے کہ لوگ، ان رسولوں کو خدا نہ سمجھ لیں۔ جان لیں کہ وہ بشر ہیں۔ لیکن آپ دیکھئے کہ جن لوگوں نے رسولوں کو خدا سمجھ لیا تھا، خدا ان کے اس باطل عقیدہ کی تردید کس دلیل سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان لوگوں کی عقل و فکر پر غور کرو جو حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہؑ کو معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ یہ اتنا نہیں سمجھتے کہ کَانَا یَاْکُلَانِ الطَّعَامَ (۵/۷۵) وہ کھانا کھاتے تھے۔ اور جو کھانے پینے کا محتاج ہو، وہ خدا نہیں ہو سکتا ——— یہ ہے وہ دلیل جس سے اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں کے اس باطل عقیدہ کی تردید کی ہے ——— اُس نے کہیں یہ نہیں کہا کہ تم دیکھتے نہیں کہ ان سے لغزشیں بھی سرزد ہوتی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس سے لغزش سرزد ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا! لیکن مودودی صاحب (معاذ اللہ) خدا کو بھی پڑھانے بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کو دراصل یہ دلیل دینی چاہئے تھی۔ بالفاظ دیگر خدا اپنے رسولوں سے اس لئے لغزشیں سرزد کراتا تھا کہ لوگ انھیں خدا نہ سمجھ لیں، لیکن جو انھیں خدا سمجھ لیتے تھے ان کی تردید کے لئے ان لغزشوں کو بطور دلیل اور ثبوت پیش نہیں کرتا تھا۔ دلیل یہ دیتا تھا کہ دیکھئے یہ کھانا کھاتے ہیں اس لئے خدا کیسے ہو سکتے ہیں:

یہ ہے بہرکیف وہ تفسیر جس پر مودودی صاحب کو اللہ کا شاہکار قرار دیا جاتا ہے۔ اس تفسیر کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

(۵) رسول اللہؐ پر (معاذاللہ) جادو

قرآن کریم کی آخری دو سورتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ (معاذ اللہ) رسول اللہؐ پر جادو کر دیا گیا تھا" اور وہ اس کے زیر اثر آ گئے تھے۔ مخالفین کے وضع کردہ اس افسانہ کو آپ مودودی صاحب کے الفاظ میں سنیئے، انہوں نے لکھا ہے:-

> صلح حدیبیہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۷ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا۔ اور ایک مشہور جادوگر سے ملا۔ اور اس سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں۔ انھیں قبول کرو اور محمد پر ایک زور کا جادو کرو۔ اس زمانے میں حضورؐ کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار رہتا۔ اس سے سازباز کر کے ان لوگوں نے
>
> حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا..... آپ پر اس جادو کا یہ اثر ہوا کہ آپؐ گھلتے چلے جا رہے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا، اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپؐ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے، مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ (تفہیم القرآن جلد ششم ۵۵۴ بحوالہ طلوع اسلام جولائی ۱۹۷۳ء)

ہم بغیر اس بحث میں پڑے کہ جادو کی حقیقت کیا ہے، مودودی صاحب کے پیش

زمودہ افسانے کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ یہ قرآنِ کریم کی کھلی ہوئی مخالفت اور اس الزام کو صحیح ثابت کرنے کی مذموم کوشش ہے جو کفار حضورؐ کے خلاف عائد کیا کرتے تھے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (۴۷) "یہ ظالم، مومنین سے کہتے ہیں کہ تم ایسے شخص کا اتباع کرتے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے" اور اس کے بعد خدا کا ارشاد یہ ہے کہ اے رسولؐ! دیکھو یہ مخالفین تمہارے خلاف کس قسم کی بہتان تراشی کرتے ہیں، قرآنِ کریم اس بات کو حضورؐ کے خلاف کفار کی بہتان تراشی قرار دیتا ہے جو کہتے تھے کہ آپؐ پر جادو کر دیا گیا ہے، اور مودودی صاحب کفار کے اس الزام کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

اس کے جواب میں مودودی صاحب کے مصاحب یہ کہہ دیں گے کہ یہ کچھ مودودی صاحب نے اپنی طرف سے نہیں کہا۔ یہ واقعہ تو حدیثوں میں درج ہے انہوں نے اپنے ہاں اُسی کو نقل کیا ہے اس سلسلہ میں پہلی چیز تو یہی کافی ہے کہ خود متبعین حدیث کے نزدیک روایات کے صحیح اور وضعی ہونے کا اولین معیار یہ ہے کہ کوئی روایت جو قرآن کے خلاف ہو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ اور جو روایت مودودی صاحب نے درج کی ہے وہ بالفاظِ صریح قرآنِ کریم کے خلاف ہے لہٰذا خود ان حضرات کے معیار کے مطابق بھی وہ صحیح قرار نہیں پا سکتی، دوسرے یہ کہ اہلِ حدیث تو اس امر پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ کم از کم بخاری اور مسلم کی ہر حدیث کو صحیح قرار دیں، لیکن مودودی صاحب کا یہ عقیدہ نہیں، ان کا عقیدہ یہ ہے :-

> یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں
> ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے
> (ترجمان القرآن۔ اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ء)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریقِ مخالف) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں، ہم سند

کی محبت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔
(رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۹۰)

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک احادیث کے پرکھنے کا معیار کیا ہے۔ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ اس کا فیصلہ مزاج شناسِ رسول کی نگہ بصیرت ہی کر سکتی ہے جس حدیث کو وہ صحیح قرار دے وہ صحیح ہے جسے وہ غلط قرار دیدے وہ غلط سمجھی جائے گی (تفہیمات حصہ اول صفحہ (۳۲۴ تا ۳۰۲) اور یہ واضح ہے کہ جماعت اسلامی کے نزدیک "مزاج شناسِ رسول" خود مودودی صاحب ہیں۔ لہٰذا مودودی صاحب جو احادیث نقل کرتے ہیں وہ اس مجبوری کے ماتحت نہیں کرتے کہ ان کے عقیدہ کی رو سے ہر حدیث کا صحیح ماننا ضروری ہے، وہ انہی احادیث کو درج کرتے ہیں جو خود ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے حضورؐ پر جادو کے خلافِ قرآن واقعہ کو جو درج کیا ہے تو اس لئے کہ وہ اس روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ خود سوچیئے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اس الزام تراشی کی ذمہ داری خود مودودی صاحب پر عائد ہوتی ہے یا نہیں۔

(۶) جنسی بدنہادی

یوں تو ہم نے مودودی صاحب کی تفسیر کی چند مثالیں پیش کرتے ہوئے ہر مثال کو سینے پر پتھر رکھ کر پیش کیا ہے۔ لیکن آخر میں دو ایک مثالیں ایسی بھی دینی پڑ گئی ہیں جنکے تصور تک سے ہمارا کلیجہ شق ہو کر رہ جاتا ہے۔ عرصہ کی بات ہے ایک امریکن اہلِ قلم عورت نے "مدر انڈیا" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں ہندوؤں کی معاشرتی زندگی کے تاریک گوشے نمایاں طور پر پیش کئے گئے تھے یوں تو اس میں بیان کردہ ہر واقعہ انتہائی شرمناک تھا لیکن اس کا وہ باب جس میں اس نے لکھا تھا کہ ہندوؤں کے ہاں نابالغ لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے اور جب ایسی معصوم لڑکیوں کے ساتھ ان کا خاوند جنسی اختلاط کرتا ہے تو اس مظلوم کی چیخ و پکار سے کس طرح زمین کانپ اٹھتی ہے۔ اس کے اس باب نے دنیا میں ارتعاش پیدا کر دیا اور ہندو دانشوروں تک کے ضمیر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ (غالباً) اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں نے سارداایکٹ کی رو سے اپنے ہاں نابالغوں کی شادی کو قانوناً ممنوع قرار دلوا دیا تھا۔ لیکن ہمارے یہ مفسر و مفکر نہ صرف نابالغ لڑکی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیتے

ہیں بلکہ اس کے بعد یہ بھی بالفاظِ صریح ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔

(تفہیم القرآن جلد پنجم صفحہ ۵۰۱)

اس پر ہم نہ معلوم کیا کچھ کہنے کے لئے مجبور ہو جاتے لیکن حیا ہمارے گلوگیر ہو جاتی ہے ہم صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں کہ عقل و ہوش کا حامل انسان تو ایک طرف، آپ نے کسی حیوان کو بھی نابالغ کے ساتھ جنسی اختلاط کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ ایسا صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو جنسی بدنہادی (SEX PERVERSION) کے نفسیاتی مرض کا شکار ہوں۔ اب آگے بڑھیے:-

(۷) جنت کی حوریں

جنت اور جہنم کا تعلق ان ما بعد الطبیعیاتی حقائق سے ہے جن کا ادراک ہمارے شعور کی موجودہ سطح کے لئے ممکن نہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے انھیں تشبیہات کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ سورۃ الرعد میں ہے کہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ (۱۳/۳۵) "جس جنت کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے اس کی مثال یوں سمجھو"..... یعنی جنت کا بیان تمثیلی ہے۔ اُسے حقیقی الفاظ پر محمول نہیں کر لینا چاہئے۔ دوسری جگہ ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۳۲/۱۷) لوگوں کے اعمال کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان پوشیدہ رکھا ہے اسے کوئی شخص نہیں جان سکتا۔" لیکن مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ جان کیوں نہیں سکتا، کھیل بچوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا! ہم بتاتے ہیں۔ اور بتانے کے لئے ان کی نگہ انتخاب حوروں پر جا کر ٹکتی ہے۔ سنئے ... اور کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر سنئے کہ وہ ان کے متعلق کیا کہتے ہیں، فرماتے ہیں

> کفار کی وہ لڑکیاں جو سنِ رُشد کو پہنچنے سے پہلے مرگئی ہوں انہیں حوریں بنا دیا جائیگا اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں رہیں گی یہ حوریں بیویوں کے علاوہ ہوں گی۔ بیویاں جنتی مردوں کے ساتھ محلات میں رہیں گی لیکن جب وہ پکنک منانے کیلئے باہر جائیں گے تو ان کی سیر گاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔ (تفہیم القرآن۔ جلد چہارم صفحہ ۲۸۶)

جلد پنجم صفحہ ۳۵)

قطع نظر اس کے کہ اُس ذہنیت کے متعلق کچھ کہا جائے جس پر جنسی جذبہ اس قدر غالب ہے، ہم ارباب بصیرت سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ غیر مسلموں کے سامنے جب یہ تصور پیش کیا جائے گا تو ان میں سے کوئی غیرت مند باپ بھی اس مذہب کے قریب آنا برداشت کرے گا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ مخالفین کی اسلام کے خلاف بڑی بڑی ضخیم جلدیں ایک طرف اور مودودی صاحب کے یہ دو فقرے ایک طرف۔ دنیا کو اسلام سے متنفر کرنے کے لئے یہ دو فقرے ان سب پر بھاری ہوں گے۔ طلوع اسلام میں ایک دفعہ لکھا گیا تھا کہ مودودی صاحب یہ مشن لے کر یہاں آئے ہیں کہ اس مملکت کو کسی حال میں بھی مستحکم نہ ہونے دیا جائے اور اسلام کا ایسا تصور پیش کیا جائے جو لوگوں کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت اور سرکشی کے جذبات بیدار کر دے، ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام کا جو نقشہ مودودی صاحب نے کھینچا ہے وہ ان کی اسی ٹیکنک کی ایک کڑی ہے۔

یہ ہیں چند ایک جھلکیاں مودودی صاحب کے اس شاہکار کی۔ اس تفسیر کا پراپیگنڈہ کس انداز سے کیا گیا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ کراچی کے سب سے بڑے انگریزی ہوٹل میٹروپول اور اس کے بعد لاہور کے اسی پایہ کے ہوٹل "انٹرکانٹی نینٹل" میں اس کی تعارفی تقاریب منعقد کی گئیں۔ واضح رہے کہ ان ہوٹلوں میں ایک ایک پیالی چائے دو دو تین تین روپے میں پڑتی ہے۔ ان تقاریب میں ملک کے نامور ارباب دانش و بینش نے اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ پھر اسی قسم کی ایک اور ذی شان تقریب میں اسکے چند ایک ٹکڑوں کے انگریزی ترجمہ کا تعارفی اجتماع بھی منعقد ہوا۔ اس میں بھی ان جواہر پاروں کو دنیا کے نوادرات میں شمار کیا گیا۔ مجھے اس پر کسی قسم کے اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اپنا مال بیچنے کے لئے کوئی جو طریقہ اختیار کرنا چاہے کرے، دوسروں کو اس پر لب کشائی کا کیا حق ہے۔ لیکن میں ان تقاریب میں، دیگر خطاب کرنے والوں کو بالعموم اور مسٹر اے کے بروہی سے بالخصوص ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں بروہی صاحب۔ سے بالخصوص اس لئے کہ جماعت اسلامی والے ہر جگہ کہتے پھرتے ہیں کہ جس تفسیر کی بروہی صاحب جیسے بین الاقوامی شہرت کے مالک قانون دان اور مفکر نے اتنی تعریف کی ہو: اس کے متعلق آپ خود فیصلہ کیجئے کہ وہ کس قدر بلند پایہ ہوگی۔ میں محترم بروہی صاحب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ نے اس تفسیر کا خود مطالعہ

فرمایا تھا اور کیا اس میں وہ "حقائق" بھی نظر آئے تھے جن کی مثالیں میں نے ابھی ابھی پیش کی ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں وہ تفسیر قرآنِ کریم کی تفسیر کہلانے کی مستحق ہے جس میں اس قسم کے خرافاتی افسانے درج ہوں جن پر عقل روئے، علم ماتم کرے اور حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جائیں۔

اور ذاتی طور پر تو میرا خیال ہے کہ ان لغویات کو خود مودودی صاحب بھی صحیح نہیں سمجھتے ہونگے۔ چونکہ ملک کی اسی نوے فیصد آبادی انہی باتوں کو صحیح اسلام سمجھتی ہے اس لئے مقبولیت عام کا تقاضا مودودی صاحب کو اس قسم کی باتیں کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، ورنہ یہ ماننے کو جی ہی نہیں چاہتا کہ جو شخص دنیاوی امور میں اس قدر زیرک ہو، وہ اتنا بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ باتیں کس قدر ابلہانہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خود ان کی زیرکی اور کاروباری معاملہ فہمی کی دلیل ہے کہ وہ اپنی دکان میں ہر قسم کا مال رکھتے ہیں تاکہ کوئی گاہک بھی خالی ہاتھ نہ لوٹے۔ ان کے لٹریچر میں اس قدر متضاد باتیں ملے گی کہ انسان حیران رہ جائے گا، لیکن بادنیٰ تعمق یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ وہ نہ قدامت پرست ہیں نہ ماڈرن۔ وہ بیچ کی راس کے آدمی ہیں۔ بیچ کی راس کے آدمی کو تو دونوں طرف نگاہ رکھنی پڑتی ہے، اس لئے وہ دیدہ دانستہ ایسی باتیں لکھتے رہتے ہیں۔ اِس قسم کی روش سے دکان تو بے شک چمک اُٹھتی ہے، لیکن اس سے اسلام کے ساتھ جو مذاق ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جو مجھے اس قسم کے تبصروں پر مجبور کر دیتا ہے۔ ورنہ مجھے ان سے کیا واسطہ؟ نہ دین فروشی میرا پیشہ ہے جو مجھے ان سے رقیبانہ چشمک ہو۔ نہ ہوسِ اقتدار میری کمزوری، جو مجھے ان کی امارت چھیننے کا شوق ہو۔ اسلام سے مجھے محبت ہے اللہ جو شخص اسے بدنام کرتا ہے، اس کی مخالفت میرا تقاضائے ایمان۔

والسلام